الرسالہ

Al-Risala

August 1996 • Issue 237 • Rs. 7

کسی مسئلہ کو حل کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ
اس مسئلہ کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیا جائے۔

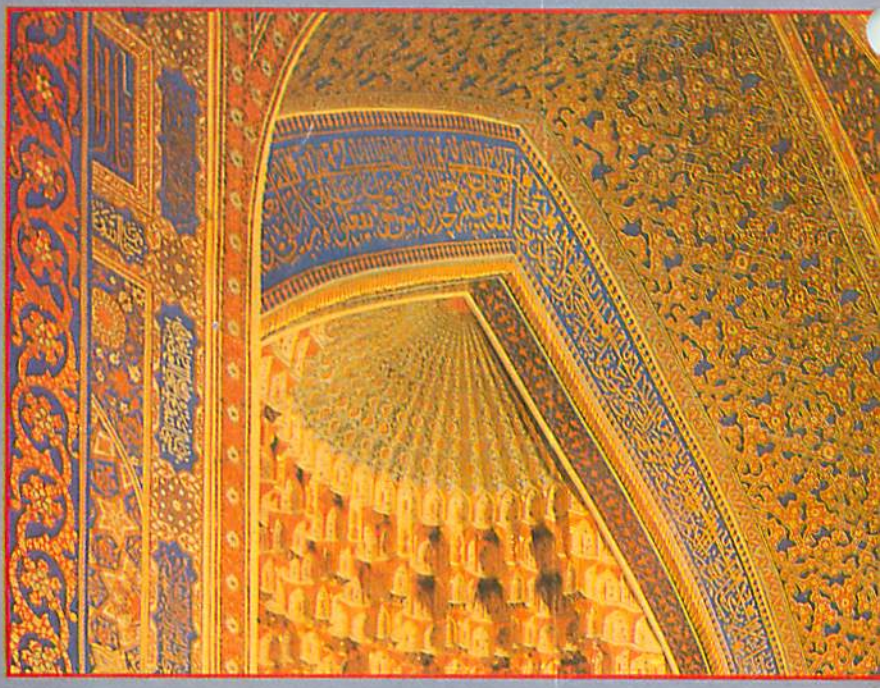

The Islamic Centre Publications

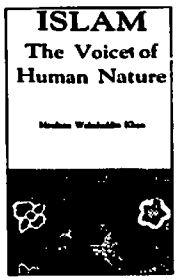

ISLAM: THE VOICE OF HUMAN NATURE
22×14.5cm, 64 pages
ISBN 81-85063-74-5
Rs. 30

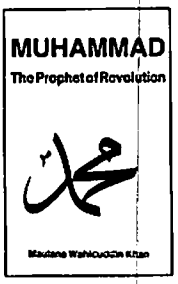

MUHAMMAD: THE PROPHET OF REVOLUTION
22×14.5cm, 228 pages
ISBN 81-85063-00-1
Rs. 85

GOD-ORIENTED LIFE
22×14.5cm, 186 pages
ISBN 81-85063-97-4
Rs. 70

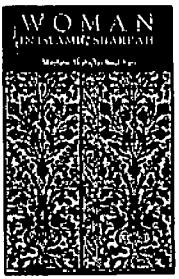

WOMAN IN ISLAMIC SHARI'AH
22×14.5cm, 150 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 185 (Hardbound)

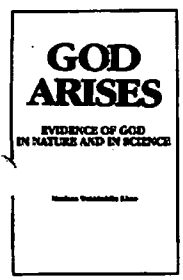

GOD ARISES
22×14.5cm, 271 pages
ISBN 81-85063-14-1
Rs. 85

ISLAM AS IT IS
22×14.5cm, 114 pages
ISBN 81-85063-95-8
Rs. 55

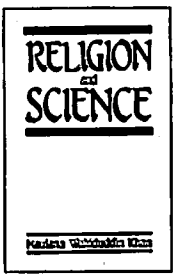

RELIGION AND SCIENCE
22×14.5cm, 96 pages
Rs. 45

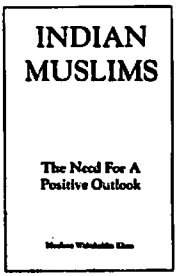

INDIAN MUSLIMS
22×14.5cm, 192 pages
Rs. 65 (Paperback)
Rs. 175 (Hardbound)

'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this 'Introduction to Islam' series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre, New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way. The complete series is as follows:

1. The Way to Find God (20 pages; Rs. 12)
2. The Teachings of Islam (46 pages; Rs. 15)
3. The Good Life (36 pages; Rs. 12)
4. The Garden of Paradise (36 pages; Rs. 15)
5. The Fire of Hell (44 pages; Rs. 15)

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. In the first pamphlet it is shown that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet provides an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to hell-fire.

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013 Tel. 4611128 Fax: 11-4697333

حُریتِ فکر

فکر و خیال کی آزادی اور اسلام

مولانا وحید الدین خاں

AL-RISALA (Urdu)

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013, Tel. 4611128, 4611131 Fax: 91-11-4697333

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)

Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

Distributed in UK and USA by:

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

اظہارِ خیال کی آزادی

اسلام میں انسان کو مکمل فکری آزادی دی گئی ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اسلام ہی نے پہلی بار انسانی تاریخ میں یہ انقلاب برپا کیا کہ ہر آدمی کو فکر و خیال کی آزادی ہو۔ اسلام سے پہلے تاریخ کے تمام زمانوں میں جبر کا نظام قائم تھا اور انسان فکری آزادی سے محروم تھا۔ فکری آزادی کوئی سادہ بات نہیں، حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانی ترقیوں کا راز اسی فکری آزادی میں چھپا ہوا ہے۔

فکری آزادی کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ انسان اس اعلیٰ نیکی کو حاصل کرتا ہے جس کو قرآن میں خوف بالغیب کہا گیا ہے (المائدہ ۹۴) یعنی خدا کی طرف سے ظاہری دباؤ کے بغیر خود اپنے ارادہ کے تحت آزادانہ طور پر خدا کا اعتراف کرنا اور اس سے ڈر کر دنیا میں رہنا۔ جب تک مکمل آزادی کا ماحول نہ ہو کسی کو اس ناقابل بیان لذتِ روحانی کا تجربہ نہیں ہو سکتا جس کو غیب میں خدا سے ڈرنا کہا گیا ہے۔ اور نہ یہی ممکن ہے کہ کسی کو اس اعلیٰ انسانی عمل کا کریڈٹ دیا جا سکے۔

آزادئ فکر وہ چیز ہے جو آدمی کو منافقت سے بچاتی ہے۔ انسان ایک سوچنے والی مخلوق ہے۔ اس کا ذہن لازمی طور پر سوچتا ہے اور رائے قائم کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر آزادانہ اظہار رائے پر پابندی لگا دی جائے تو لوگوں کی سوچ تو بند نہیں ہوگی البتہ ان کی سوچ زبان و قلم پر نہیں آئے گی۔ جو ادارہ یا جو قوم یا جو ریاست اظہارِ خیال کی آزادی پر پابندی لگائے وہ آخر کار منافقتوں سے بھر جائے گا۔ ایسے ماحول کے اندر مخلص انسان کبھی پرورش نہیں پا سکتے۔

اسی طرح فکری آزادی کا براہ راست تعلق تخلیقیت سے ہے۔ جس سماج میں فکر و خیال کی آزادی ہو وہاں تخلیقی انسان جنم لیں گے۔ اور جس سماج میں فکر و خیال کی آزادی پر روک لگا دی جائے وہاں لازمی طور پر ذہنی جمود طاری ہو جائے گا اور نتیجۃً یہ ہوگا کہ ایسے سماج میں تخلیقی ذہن کی پرورش اور اس کا ارتقاء ہمیشہ کے لیے رک جائے گا۔

اظہارِ اختلاف یا تنقید کے معاملہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ لوگ اس معاملہ میں اپنی غیر ضروری حساسیت کو ختم کر دیں نہ یہ کہ خود تنقید و اختلاف کے عمل کو بند کرنے کی کوشش کریں۔ یہی اسلام کا تقاضا ہے اور یہی فطرت کا تقاضا بھی۔

حدیث میں مومن کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ : الذین اذا اُعطوا الحق قبلوہ (مسند احمد) یعنی
ں کہ جب انھیں کوئی حق دیا جائے تو وہ اس کو قبول کرلیں۔ یہاں حق سے مراد امر حق ہے۔
رے لفظوں میں یہ کہ مومن وہ ہے جس کے اندر اعتراف حق کا مادہ کامل طور پر موجود ہو۔ جب بھی کوئی
اس کے سامنے لائی جائے، جب بھی اس کی کسی غلطی کی نشاندہی کی جائے تو کوئی بھی احساس
کے لیے قبول حق کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

اس صفت کا کامل درجہ یہ ہے کہ آدمی خود ہی پیشگی طور پر اس انتظار میں رہے کہ کب کوئی
نے والا اس کو اس قسم کی کوئی بات بتائے اور وہ خوش دلی کے ساتھ فوراً اسے اپنا لے۔ وہ اپنی
ح اور اپنی درستگی کا حریص بن جائے۔ یہی مومنانہ کیفیت حضرت عمر فاروقؓ کی زبان سے ان
میں ظاہر ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ اللہ اس انسان پر رحم کرے جو میرے عیوب کا تحفہ مجھے
ے (رحم اللہ امرأ اھدیٰ الیّ عیوبی)

حقیقت یہ ہے کہ اعتراف حق ایک عبادت ہے، بلکہ وہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ
ں ہے جس کے لیے آدمی کو سب سے بڑی قربانی دینا ہوتا ہے، یہ سب سے بڑی قربانی اس کو
سے بڑی عبادت بنا دیتی ہے۔ یہ قربانی اپنے وقار کی قربانی ہے۔ یہ اپنی بڑائی کو کھونے کی
ں ہے۔ یہ حق کے لیے اپنے آپ کو بے قیمت کرنے کی قربانی ہے۔ یہ وہ موقع ہے جب کہ آدمی
ں کی قیمت دے کر جنت میں داخلہ کا استحقاق حاصل کر لیتا ہے۔

اس عظیم عبادت اور اس عظیم خوش قسمتی کا موقع کسی کو کب ملتا ہے۔ یہ موقع صرف اس
ملتا ہے جب کہ لوگوں کو اظہار خیال کی پوری آزادی ہو۔ جب کسی رکاوٹ کے بغیر ایک آدمی
رے آدمی پر تنقید کر سکے۔ جب معاشرہ میں یہ ماحول ہو کہ کہنے والا بے تکلف اپنی بات کو
اور سننے والا کھلے طور پر اس کو سنے۔

جس طرح مسجد نماز با جماعت کی ادائیگی کا مقام ہے، اسی طرح اظہار خیال کی آزادی گویا وہ
ار ماحول ہے جس کے اندر حق کو کہنے اور حق کو قبول کرنے والی عظیم نیکیاں جنم لیتی ہیں۔
رح کے ماحول میں وہ معاملات پیش آتے ہیں جب کہ ایک شخص کو اعلان حق کا کریڈٹ دیا جائے اور
رے شخص کو قبول حق کا انعام۔

خدا کا تخلیقی نقشہ

دنیا میں ہدایت کا نظام ایمان بالغیب (البقرہ ۳) کے اصول پر قائم ہے۔ یعنی یہاں تم
حقیقتوں کو غیر مرئی حالت میں رکھ دیا گیا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اپنی فکری قوتوں کو
میں لاکر ان پوشیدہ حقیقتوں کو دریافت کرے اور پھر ان کی کامل مطابقت میں اپنی زندگی گزار
انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کو اپنا بڑا بنائے، حالاں کہ خدا کی بڑائی اس کی آنکھو
سامنے موجود نہیں۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کی پکڑ سے ڈرے، حالاں کہ خدا کی تعذیبی طا
دنیا میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اسی طرح انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ داعیان حق کا ساتھ د
مگر داعیان حق ہمیشہ عام انسان کے روپ میں سامنے آتے ہیں، ان کو پہچاننا صرف اس کے
ممکن ہوتا ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن کی سطح پر دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

یہی عام دنیوی چیزوں کا معاملہ بھی ہے۔ دنیا میں بے شمار مادی امکانات تھے۔ مگر وہ
زمین کے اندر چھپا کر رکھ دیے گئے۔ ان مادی امکانات کو دریافت کرکے انھیں ایک ترقی
تمدن کی صورت دینا، یہ انسان کا کام تھا جو موجودہ زمانہ میں بڑے پیمانہ پر انجام دیا گیا ہے۔

اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فطرت کا طریقہ عین وہی ہے جس کو فن تعلیم میں اکتشافی ط
(discovery method) کہا جاتا ہے۔

اس اکتشافی طریقہ کو قابل عمل بنانے کے لیے انسان کو ایک اعلیٰ درجہ کا ذہن دیا گیا جو ا
طور پر ہر قسم کی ضروری صلاحیتوں سے بھرا ہوا تھا۔ انسان کا ذہن اس قابل تھا کہ وہ غور و فکر کرے
اشیاء کی حقیقتوں کو جانے۔ ایک طرف وہ اپنے خالق کو پہچانے، اور دوسری طرف دنیا کے ا
چھپی ہوئی مادی نعمتوں کو دریافت کرکے انھیں اپنی تعمیر حیات میں استعمال کرے۔

پیغمبر کی حیثیت اس عمل میں ایک مستند رہ نما کی ہے۔ خدا کا پیغمبر وہ بنیادی اصول دے
ہے جس کی رہ نمائی میں انسان اپنا اکتشافی سفر شروع کرے اور اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچا
اس طرح جو حقیقت ملتی ہے وہ آدمی کے لیے اس کی ذاتی دریافت ہوتی ہے۔ وہ اس کی پو
شخصیت کو متاثر کرتی ہے۔ وہ اس کے لیے ابدی سرمایۂ حیات بن جاتی ہے۔

مگر دنیا کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر انسانیت کے آغاز کے جلد ہی بعد
اہت کی صورت میں جبر کا نظام قائم ہو گیا۔ تمام آباد دنیا کچھ بادشاہوں کے زیر قبضہ آ گئی۔ ان
اہوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لیے کامل جبر کا نظام اختیار کر لیا۔ اس طرح ساری دنیا
آزادانہ فکر اور آزادانہ اظہار خیال کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ چیز جس کو آزادیٔ اظہار (freedom of speech)
اتا ہے وہ قدیم دنیا میں سرے سے موجود ہی نہ تھی۔

یہی جبر کا نظام ہے جس نے پچھلے زمانوں میں پیغمبروں کی بات کو چلنے نہیں دیا۔ پھر یہی جبر کا نظام
ہے جو سائنسی دریافتوں اور ترقیوں میں مسلسل رکاوٹ بنا رہا۔ کیوں کہ کوئی بھی تصور اپنے ارتقاء کے
آزادانہ سوچ اور آزادانہ بحث چاہتا ہے۔ قدیم نظام جبر میں اظہار خیال کی آزادی نہ تھی، اس
کھلا غور و فکر بھی اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عامہ کے علاوہ یہ خاص کام بھی سونپا گیا کہ وہ دنیا میں قائم شدہ
کے نظام کو توڑ دیں۔ اس کے لیے انھیں خصوصی طور پر تمام ضروری مدد فراہم کی گئی۔ چنانچہ آپ نے
آپ کے ساتھیوں نے سو سال سے بھی کم عرصہ میں ساری دنیا میں یا تو شاہی جبر کے اداروں کو توڑ
یا اس کی بنیادیں اتنی کمزور کر دیں کہ اپنے وقت پر وہ خود ہی گر پڑے۔ اس سلسلہ میں رسولؐ اور
اب رسولؐ نے جو جہاد کیا وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قسم کا خدائی آپریشن تھا جس کا مقصد
اکہ جبر کے مصنوعی نظام کو توڑ کر آزادیٔ فکر کے فطری نظام کو قائم کر دیا جائے، تاکہ انسان کے لیے
م کی دینی اور دنیوی ترقی کا دروازہ کھل جائے۔

اسی نظام جبر کو قرآن میں فتنہ کہا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ اس نظام کے حاملین سے جنگ کرو یہاں
ک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لیے ہو جائے (الانفال ۳۹) اس آیت میں دین سے مراد
شرعی نہیں ہے بلکہ دین فطری ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی تخلیقی اسکیم میں خلل ڈالنے
لے ان ظالموں سے جنگ کرو تاکہ فکری جبر کا غیر فطری نظام جو انھوں نے رائج کر رکھا ہے اس کا
ہو اور فکری آزادی کی بنیاد پر خدا کا مطلوب نظام دنیا میں قائم ہو سکے۔ مصنوعی حالت ختم ہو کر
ں فطری حالت زمین پر بحال ہو جائے۔ یہ کام اب مکمل طور پر ساری دنیا میں انجام پا چکا ہے۔
ر اس نے انسان کے اوپر ہر قسم کی سعادت کے دروازے کھول دیے ہیں۔

تواصی بالحق

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں خسران اور گھاٹے سے صرف وہ لوگ محفوظ رہیں جو تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا کام کریں (سورہ العصر) اسی طرح قرآن میں خیر امت یا بہتر گروہ کی خاص صفت یہ بتائی گئی ہے کہ ان کے درمیان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم ہو (آل عمران)

یہ تواصی بالحق یا امر بالمعروف کیا ہے، وہ حدیث کے الفاظ میں یہ ہے کہ کوئی آدمی جب نادرست بات دیکھے تو وہ اس کو درست کرنے کی کوشش کرے۔ طاقت ہو تو ہاتھ سے طاقت نہ ہو تو زبان سے۔ تواصی بالحق اسی عمل کا ابتدائی درجہ ہے، اور امر بالمعروف اسی عمل کا درجہ بام مرحلہ۔

اس مطلوب شرعی عمل کو کسی سماج میں جاری کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہاں اظہار کی مکمل آزادی ہو۔ ہر آدمی کے لیے یہ ممکن ہو کہ جب بھی وہ کسی خلاف حق بات کو دیکھے تو وہ کسی رکاوٹ کے بغیر کھلے طور پر اس کے بارہ میں بول سکے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ حق اور ناحق کا اصل معیار قرآن و سنت ہے نہ کہ کسی شخص کا اپنا خیال اس لیے جب بھی کوئی شخص اس احساس میں مبتلا ہوگا تو وہ سب سے پہلے زبان یا قلم کے ذریعہ کا اظہار کرے گا تاکہ اس پر بحث شروع ہو۔ اس طرح بحث و مباحثہ کے بعد یہ ثابت ہوگا کہ کیا درست ہے اور کیا چیز نادرست۔ اس طرح ثابت ہونے کے بعد صاحب اثر افراد کا یہ کام کہ وہ اس کو حسب استطاعت عملاً نافذ کریں۔ گویا تواصی بالحق اور امر بالمعروف کی تعلیم کا تقاضا ہے مسلم معاشرہ میں دائمی طور پر اظہار خیال کی آزادی موجود رہے۔ اس قسم کی آزادی کے بغیر یہ شرعی عمل سرے سے اپنی صحیح صورت میں جاری ہی نہیں رہے گا۔

اسلام چاہتا ہے کہ ہر شخص کو کسی روک ٹوک کے بغیر یہ آزادی حاصل ہو کہ وہ دوسروں کے بارہ میں اپنی رائے دے سکے۔ اس عمل کے پیچھے اگر واقعۃً نیک جذبہ کارفرما ہوگا تو اس یہ عمل قابل انعام ہوگا۔ اور اگر اس نے کسی برے جذبہ سے یہ کام کیا ہوگا تو وہ خدا کے یہ قابل سزا قرار پائے گا۔

قرآن میں حضرت مسیح کی زبان سے یہ آیت ہے کہ وجعلنی مبارکاً اینما کنت (مریم ۳۱) مجاہد نے اس کی تفسیر میں کہا کہ : معلماً للخیر۔ یعنی خدا نے مجھ کو خیر کا معلم بنایا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : المؤمن مرآۃ المومن (سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی النصیحۃ) یعنی ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ کی مانند ہے۔ جس طرح آدمی آئینہ کے سامنے کھڑا ہو تو آئینہ کسی کمی بیشی کے بغیر اس کا اصل چہرہ اسے دکھا دے گا۔ اسی طرح مومن اپنے بھائی کو اس کی کمیوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ اپنے آپ کو اونچا سمجھے اور دوسرے کو نیچا۔

یہی بات دوسری حدیث میں اس طرح ہے کہ : فطوبیٰ لعبد جعلہ اللہ مفتاحاً للخیر مغلاقاً للشر (ابن ماجہ، مقدمہ) یعنی بابرکت ہے وہ بندہ جس کو اللہ نے خیر کا دروازہ کھولنے والا اور شر کا دروازہ بند کرنے والا بنایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی سچا خدا پرست ہو وہ خیر اور شر کے بارہ میں انتہائی حساس ہوگا۔ اس کی یہ حساسیت اس کو مجبور کرے گی کہ جب بھی وہ کوئی خلاف حق بات دیکھے تو فوراً اس کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔

تاہم یہ بات یک طرفہ نہیں ہے۔ خدا پرستی جس طرح آدمی کے اندر اظہار حق کا جذبہ ابھارتی ہے، اسی طرح وہ قبول حق کا جذبہ بھی آخری حد تک اس کے اندر پیدا کر دیتی ہے۔ ایسا آدمی جس طرح دوسروں کے خلاف تنقید یا اظہار رائے کرتا ہے، وہ خود بھی ہر وقت اس کے لیے تیار رہتا ہے کہ جب بھی اس کے سامنے امر حق پیش کیا جائے وہ فوراً اس کو قبول کر لے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کے اوپر تنقید کا حق صرف اسی شخص کو ہے جو اسی شدت کے ساتھ خود اپنا بھی احتساب کرتا ہو۔ دوسروں کو نصیحت کرنا اسی کے لیے جائز ہے جو قلب و ذہن کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کے لیے تیار رہے کہ جب بھی اس کے سامنے حق پیش کیا جائے گا تو انانیت یا وقار کا سوال اس کے لیے حق کی قبولیت میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ وہ کھلے دل کے ساتھ فوراً اس کو قبول کر لے گا۔

تواصی بالحق یا امر بالمعروف کا کام اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب کہ وہ دو طرفہ ہو۔ اگر وہ یک طرفہ ہو، ایک سنانے والا ہو اور دوسرا صرف سننے والا، تو ایسے ماحول میں کبھی وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو تواصی بالحق اور امر بالمعروف کے نظام سے مطلوب ہے۔

اختلاف میں رحمت

ایک حدیث ہے کہ : (اختلاف امتی رحمۃ (میری امت کا اختلاف رحمت ہے) محقق علماء اس کو مستند احادیث میں شمار نہیں کرتے۔ یہ بات بجائے خود درست ہو سکتی ہے۔ مگر دوسری ناقابل انکار حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کا پورا ذخیرہ جو ہمارے پاس موجود ہے، اس میں خود علمائے امت نے بے شمار اختلافات کیے ہیں۔ قرآن کی تفسیریں اختلافات سے بھری ہوئی ہیں، اسی طرح احادیث کی شرحوں کا یہ حال ہے کہ شاید کوئی بھی حدیث ایسی نہیں جس کی تشریح میں اختلاف موجود نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ یہ اختلافات کیوں۔ اور یہ کہ یہ اختلاف رحمت تھا یا زحمت۔ قرآن ایسی ریاضیاتی زبان میں اتر سکتا تھا کہ اس کی تفسیر و تاویل میں کسی قسم کے اختلاف کی سرے سے گنجائش ہی نہ ہو۔ اسی طرح حدیثوں میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے الفاظ اختیار کر سکتے تھے جو دو اور دو چار کی مانند ہوں، اور اس کا امکان ہی نہ ہو کہ ان کی شرح میں کوئی شخص اختلاف کا پہلو نکالے۔

اصل یہ ہے کہ اختلاف کوئی غیر مطلوب چیز نہیں، بلکہ وہ عین مطلوب ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ لوگ قرآن و حدیث میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کریں۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ اسلام ان کے لیے کوئی جامد چیز نہ ہو بلکہ وہ ان کے لیے خود دریافت کردہ حقیقت بن جائے۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ لوگوں کے اندر ذہنی سرگرمیاں جاری ہوں اور آخر کار ہر ایک مومن کو تخلیقی فکر کا حامل انسان بنا دیں۔

الزام تراشی اور عیب جوئی ایک جرم ہے۔ بلکہ وہ کمینہ پن ہے جو بلاشبہ سب سے بری اخلاقی صفت ہے۔ مگر علمی اختلاف جو سنجیدہ غور و فکر سے ابھرتا ہے، وہ تو ایک نعمت ہے اور انسانیت کی ترقی کے لیے لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جو سماج اختلاف سے خالی ہو جائے وہ ترقی سے بھی خالی ہو جائے گا۔

انسان کا ذہن ایک بند خزانہ ہے۔ اس بند خزانہ کو جو چیز کھولتی ہے وہ یہی اختلاف ہے۔ اختلاف رائے سے ذہن ترقی کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک انسان سپر انسان بن جاتا ہے۔

آج ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ اختلاف کیا جائے یا نہ کیا جائے، اختلاف تو ہر وقت ہی ہر سطح پر اور ہر دینی معاملہ میں موجود ہے، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ دین میں روز اول سے آج تک جو بے شمار اختلافات پائے جا رہے ہیں ان کی توجیہہ کیا کی جائے۔ گویا مسئلہ موجودگی کی توجیہہ کا ہے نہ کہ اس کو باقی رکھنے کا یا باقی نہ رکھنے کا۔

مثلاً آپ قرآن کا مطالعہ شروع کریں اور اس کے لیے کوئی مستند تفسیر لیں، مثلاً القرطبی کی الجامع لاحکام القرآن۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر شروع ہوتے ہی آپ کو یہ فقرہ لکھا ہوا ملے گا: فیھا سبع وعشرون مسئلۃ (اس میں ۲۷ مسئلے ہیں) گویا چار لفظ کے ایک جملہ میں دو درجن سے زیادہ اختلافی مسائل۔ اسی طرح سورہ فاتحہ میں اتنے زیادہ مسائل ہیں کہ چند سطر کی ایک سورہ کے مباحث پورے ۴۳ صفحہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اسی طرح ۲۰ جلدوں کی یہ تفسیر آپ اس طرح پڑھیں گے کہ شاید اس کا کوئی بھی صفحہ اختلافی رایوں اور اختلافی اقوال سے خالی نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ آپ معوذتین تک پہنچیں گے تو اس کی تفسیر میں دوسرے بہت سے اختلافات کے ساتھ یہ انتہائی نوعیت کا اختلاف آپ کو پڑھنے کے لیے ملے گا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خیال کے مطابق، یہ دونوں آخری سورتیں دراصل دعا ہیں وہ قرآن کا حصہ نہیں (وزعم ابن مسعود انھما دعاء تعوذ بہ ولیستا من القرآن) القرطبی ۲۰/۲۵۱

یہی معاملہ مزید اضافہ کے ساتھ حدیث کا ہے۔ آپ اس کی کوئی بھی شرح لیں، مثلاً صحیح بخاری کی شرح فتح الباری کو لیجئے۔ آپ اس کو کھولیں تو پہلی حدیث یہ ملے گی کہ انما الاعمال بالنیات۔ یعنی عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔ یہ ایک متواتر حدیث ہے اور نہایت مستند ہے۔ مگر اس کی تقریباً نو صفحہ کی تشریح میں چھ بار اختلف اور (اختلفوا) جیسے الفاظ آئے ہیں۔ تیرہ جلدوں پر مشتمل پوری فتح الباری اسی طرح اختلافی تشریحات سے بھری ہوئی ہے۔

اس کے بعد اگر آپ فقہ اور عقائد کی کتابیں دیکھیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اختلافات کا ایک لامتناہی جنگل ہے۔ یہاں شاید کوئی ایک معاملہ بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو اختلافی رایوں سے خالی ہو۔ یہ اختلافات کوئی برائی نہیں، بلکہ وہ فکری مہمیز ہیں۔ وہ لوگوں کو سوچ پر ابھارتے ہیں، وہ ذہنوں کو متحرک کر کے انھیں ارتقاء کی طرف لے جاتے ہیں۔

نصیحت، تعییب

قرآن میں حق کے داعیوں کے لیے نُصح اور ناصح کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کا کلام نصیحت کا کلام ہوتا ہے۔ یعنی اس کے لکھنے یا بولنے کا محرک صرف اصلاح اور خیر خواہی ہوتا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا محرک نہیں ہوتا جس کے تحت وہ دوسروں کے بارہ میں بولے یا دوسروں کے اوپر قلم اٹھائے۔

ناصح کا کلام ذمہ داری کے احساس کے تحت نکلتا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے سوچتا ہے اور لکھنے سے پہلے تحقیق کرتا ہے۔ اس کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میں خاموش رہا تو میں خدا کے یہاں پکڑا جاؤں گا۔ وہ شہرت یا اظہار خویش یا کسی دنیوی فائدے کے لیے نہیں بولتا۔ وہ صرف اس لیے بولتا ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ بولنا اس کے لیے ایک فریضہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ وہ جس کے بارہ میں بولتا ہے، اس کے حق میں عین اسی وقت وہ دل سے دعا بھی کر رہا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس لکھنے اور بولنے کی دوسری صورت وہ ہے جس کو عیب جوئی یا تنقیص کہا جا سکتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ: وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون (حم السجدہ ۲۶) اس آیت میں والغوا فیہ کی تشریح حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ کی ہے کہ عیبوہ (تفسیر ابن کثیر ۴/۹۸) یعنی اس پر عیب لگاؤ، اس کو دوسروں کی نظر میں برا بتاؤ تاکہ لوگ بھڑک کر اس سے دور ہو جائیں۔

نصیحت اگر خیر خواہی کے جذبہ کے تحت نکلتی ہے تو تعییب اس کے برعکس بدخواہی کے جذبہ کے تحت۔ عیب جوئی اور الزام تراشی کرنے والے کے پیچھے نفرت، حسد، انانیت جیسے منفی محرکات ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد دوسرے کی اصلاح کرنا نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے کو گرانا اور بے وقعت کرنا ہوتا ہے۔

نصیحت نہ صرف جائز ہے بلکہ وہ کارِ ثواب ہے۔ اس کے مقابلہ میں تعییب و تنقیص یقینی طور پر حرام ہے، وہ صرف آدمی کے جرم میں اضافہ کرنے والی ہے۔ نصیحت صحت مند معاشرہ کی علامت ہے اور تعییب صرف بیمار معاشرہ کی علامت۔

جس معاشرہ میں نصیحت کی فضا ہو وہاں لوگ ایک دوسرے کو اپنا سمجھیں گے۔ لوگوں کے درمیان اعتماد کی فضا ہوگی۔ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے عزت و محبت کے جذبات ہوں گے۔ کوئی کسی کو غیر نہیں سمجھے گا۔ کوئی کسی کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔ کوئی کسی کا استحصال کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

مزید یہ کہ ایسے ماحول میں جب ایک آدمی دوسرے آدمی کے خلاف کوئی تنقیدی بات کہے گا تو سننے والا اس کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ نہیں بنائے گا۔ بلکہ اس کو ایک سادہ بات کے طور پر سنے گا۔ اس طرح یہ ممکن ہو جائے گا کہ دونوں کے درمیان کھلی گفتگو ہو۔ دونوں اپنی ذات کو الگ کر کے خالص حق تک پہنچنے کی کوشش کریں، اور پھر جو بات درست ہو اس کو بخوشی قبول کر لیں۔

اس کے برعکس تعییب (عیب جوئی) کے انداز میں صرف نقصان ہی نقصان ہے۔ عیب جوئی کرنے والے کی بات کو سن کر اگر دوسرا آدمی بھڑک اٹھے تو دونوں میں لڑائی شروع ہو جائے گی جو تمام برائیوں میں سب سے زیادہ سنگین برائی ہے۔ اور اگر بالفرض سننے والا متحمل مزاج ہے اور وہ اپنے خلاف عیب جوئی کو سن کر خاموش رہ جاتا ہے تب بھی وہ نقصان سے خالی نہیں۔ اول یہ کہ عیب لگانے والے نے اپنا وقت ضائع کیا۔ وہ اپنے اس وقت کو کسی صحت مند کام میں استعمال کر سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ معاشرہ کے اندر یہ بری روایت قائم ہوئی کہ ایک دوسرے کے خلاف بے بنیاد الزام تراشی کی جا سکتی ہے۔

اس معاملہ میں اسلام کی تعلیم اس حدیث میں ملتی ہے کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت)

قول خیر وہ ہے جو ثابت شدہ حقیقت پر مبنی ہو، جس سے کوئی تعمیری فائدہ مقصود ہو۔ جو تمام تر اظہار حق کے جذبہ کے تحت نکلا ہو۔ جو اصلاً خدا کے لیے ہو نہ کہ کسی انسان کے لیے۔

جو آدمی سنجیدہ ہو، جو اللہ سے ڈرتا ہو، اس کے دماغ میں جب کوئی بات آتی ہے تو وہ بولنے سے پہلے سوچتا ہے۔ اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی بات فی الواقع کسی مثبت قدر کی حامل ہے تو وہ بولتا ہے، ورنہ وہ خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔

افکار کا ٹکراؤ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو زمین پر بسایا تو پیشگی طور پر ان کو بتا دیا کہ نسلِ انسانی ایک دوسرے کی دشمن ہوگی (بعضکم لبعض عدو) یہ گویا خدا کے تخلیقی نقشہ کا ایک اعلان تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان جیسی ایک مخلوق جب دنیا میں آباد ہوگی تو اس کا یہاں آباد ہونا کوئی سادہ بات نہیں ہوگی۔ یہاں انسانوں کے درمیان اختلاف و نزاع کی صورتیں پیدا ہوں گی جو بعض اوقات شدید ہو کر عداوت تک جا پہنچیں گی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے اس کے خالق نے ترقی کا کیا کورس مقرر کیا ہے۔ وہ کورس یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان خیالات کا ٹکراؤ ہو۔ اس سے انسان کی ذہنی صلاحیتیں جاگیں گی اس کی تخلیقیت میں اضافہ ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں وہ نئی نئی دریافتیں کرتا چلا جائے گا۔ افکار کا ٹکراؤ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگانے کا سبب بن جائے گا۔

اس پہلو سے دیکھئے تو اظہار رائے کی آزادی انتہائی طور پر ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر آزادانہ اظہار رائے نہیں ہوگا تو خیالات کا ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ اور جب خیالات کا ٹکراؤ نہیں ہوگا تو ذہنی جمود نہیں ٹوٹے گا۔ انسان نئی حقیقتوں تک پہنچنے میں ناکام رہے گا۔

مثلاً اسلام کے دور اول میں جب قرأت کے اختلاف کی بنا پر لوگ قرآن کی تلاوت مختلف انداز سے کرنے لگے تو لوگوں میں یہ بحث شروع ہوگئی کہ کون سی قرأت صحیح ہے اور کون سی قرأت غلط۔ اس کے نتیجہ میں کتابت کے فن نے ترقی کی۔ پھر ایسا ہوا کہ لوگ قرآن کے معانی میں اختلاف کرنے لگے۔ اس نے بھی ایک لسانی بحث کا آغاز کیا جو یہاں تک پہنچا کہ مسلمانوں میں عربی زبان کے ماہرین پیدا ہوئے، اور عربی کی ڈکشنریاں تیار کی گئیں جو پہلے موجود نہ تھیں۔ اسی طرح لوگ شرعی امور میں طرح طرح کے اختلافات کرنے لگے۔ اس کی وجہ سے زبردست بحثیں شروع ہوئیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام میں علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، علم عقائد اور دوسرے علوم باقاعدہ صورت میں مدوّن ہو گئے۔ وغیرہ۔ دور اول میں اگر یہ اختلافات پیش نہ آتے تو نہ ذہنوں میں بیداری پیدا ہوتی اور نہ علوم و فنون کا ارتقاء ممکن ہوتا۔

پھر یہ عمل یہیں نہیں رکا۔ عباسی خلافت کے زمانہ تک پہنچ کر یہ ہوا کہ مسلمان ایشیا اور افریقہ کے پورے علاقہ میں پھیل گئے حتی کہ وہ یورپ کے اندر داخل ہو گئے۔ اب ان کا فکری ٹکراؤ مصر، ایران، یونان، وغیرہ ملکوں کے خیالات و افکار سے ہوا۔ اس کے فطری نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کے درمیان عقلی بحثیں شروع ہو گئیں۔ یہ فکری ٹکراؤ آخر کار یہاں تک پہنچا کہ ایک نہایت طاقت ور علم کلام مدون ہو گیا۔ یہ کام زیادہ تر عباسی خلیفہ المامون کے زمانہ میں ہوا۔ المامون نہایت فراخ دل تھا۔ اس نے اس زمانہ کے اہل علم کو اظہار خیال کی پوری آزادی دے رکھی تھی: و اطلق حریۃ الکلام للباحثین و اھل الجدل و الفلاسفۃ (الاعلام ۴/۱۴۲)

پھر یہ سیلاب یہیں نہیں رکا۔ علم و تحقیق کا یہ عمل مزید آگے بڑھ کر دوسرے علمی و فنی شعبوں تک پہنچ گیا۔ مسلمانوں میں فلسفہ، طب، ریاضی، بحریات، فلکیات، ارضیات کے ماہرین پیدا ہوئے۔ انھوں نے وقت کے تمام سیکولر علوم میں امامت کا درجہ حاصل کر لیا۔

پہلے مسلمانوں کا فکری ٹکراؤ دوسری قوموں سے ہوا تھا۔ جب مسلمان علمی ترقی میں آگے بڑھ گئے تو اب دوسری قوموں کا فکری ٹکراؤ مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے لگا۔ اس ٹکراؤ کے دوران مسلمانوں کے پیدا کردہ علوم اٹلی، اسپین، سسلی اور فرانس تک پہنچ گئے۔ اس کے نتیجہ میں یورپ میں نیا سائنسی دور شروع ہوا جو آخر کار موجودہ صنعتی انقلاب تک جا پہنچا۔ مغرب کا سائنسی اور صنعتی انقلاب براہ راست طور پر دور اول کی مسلم بیداری سے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔

وہی عرب جب تک اپنے ملک کے حدود میں بند تھے وہ کوئی علمی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ مگر جب وہ اپنے ملک سے باہر نکلے اور بیرونی قوموں سے ان کا فکری و ذہنی ٹکراؤ پیش آیا تو انھیں لوگوں نے اتنی ترقی کی کہ وہ علم و فکر کے عالمی امام بن گئے۔ یہ سارا معجزاتی واقعہ آزادانہ فکری تبادلہ کے نتیجہ میں پیش آیا۔

تنقید یا اظہار اختلاف دراصل تبادلۂ افکار ہی کا دوسرا نام ہے۔ کسی معاشرہ میں جتنا زیادہ فکری آزادی ہوگی، اتنا ہی زیادہ وہاں فکری تبادلہ ہوگا، اور اس فکری تبادلہ کے دوران تنقید اور اظہار اختلاف کی صورتیں بھی پیدا ہوں گی۔ فطرت کا مقرر کردہ یہی واحد ترقیاتی کورس ہے، افراد کے لیے بھی اور بحیثیت مجموعی پوری قوم کے لیے بھی۔

فطرت کا نظام

اسلام سے پہلے تقریباً ۲۵ ہزار سال تک انسانی تاریخ کے آثار ملتے ہیں۔ مگر اس لمبی مدت تک انسان کوئی علمی ترقی نہ کر سکا۔ تمام علمی اور سائنسی ترقیاں بعد کو اس وقت شروع ہوئیں جبکہ اسلام نے قدیم شاہانہ جبر کے نظام کو توڑ کر دنیا میں فکری آزادی کے دور کا آغاز کیا۔

اس کا راز یہ ہے کہ ذہنی ترقی ہمیشہ تبادلۂ افکار کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اور جبر اور تقلید کے نظام میں افکار کے تبادلہ کا عمل (پراسس) یکسر رک جاتا ہے۔ اسی بات کو امریکی ادیب والٹر لپمان (Walter Lippmann) نے ان لفظوں میں بیان کیا کہ جب تمام لوگ ایک طرح سوچیں تو کوئی بھی شخص بہت زیادہ نہیں سوچتا :

When all think alike, no one thinks very much.

اصل یہ ہے کہ حقائق کی دنیا ایک لامحدود دنیا ہے۔ مگر ایک شخص کا تنہا ذہن صرف محدود طور پر سوچ پاتا ہے۔ اس لیے اگر جبر اور تقلید کا ماحول ہو تو ہر آدمی صرف محدود واقفیت کا حامل ہوگا۔ اس کے برعکس اگر لوگوں کو سوچنے اور بولنے کی آزادی حاصل ہو تو لوگوں کے درمیان خیالات کا تبادلہ شروع ہو جائے گا۔ اب ہر آدمی دوسرے سے سیکھنا شروع کر دے گا۔ اس طرح مجموعی طور پر لوگ بہت زیادہ باتوں کو جان لیں گے۔ اس کے برعکس جہاں ایسا ماحول ہو جس میں تمام لوگ اپنے ہی دائرہ میں سوچیں تو ایسے ماحول میں لوگوں کی مجموعی واقفیت بھی بہت کم ہوگی۔

جب لوگوں کو سوچنے اور بولنے کی کھلی آزادی ہوگی تو لازماً اختلاف رائے پیدا ہوگا۔ لوگ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر پر تنقید کریں گے۔ یہ تنقیدی عمل ذہنی ارتقاء کا لازمی جزء ہے۔ تنقید کا خاتمہ سادہ طور پر صرف تنقید کا خاتمہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذہنی ارتقاء کا خاتمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہمارے لیے انتخاب (چوائس) تنقید اور بے تنقید میں نہیں ہے بلکہ تنقید اور ذہنی جمود میں ہے۔ اگر آپ تنقید کو بند کریں تو عملاً جو چیز باقی رہے گی وہ ذہنی جمود ہوگا نہ کہ صرف بے تنقید صورت حال۔

فکری آزادی فطرت کے نظام میں معاونت ہے اور فکری پابندی فطرت کے نظام میں رکاوٹ۔

دربارِ الٰہی میں

قرآن میں پہلے انسان (آدم) کی پیدائش کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے: اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کرے اور خون بہائے، اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھا دیے آدم کو سارے نام۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک تو ہی علیم و حکیم ہے۔ اللہ نے کہا کہ اے آدم، ان کو بتاؤ ان لوگوں کے نام۔ تو جب آدم نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام (اور فرشتوں کا اشکال ختم ہو گیا) تو اللہ نے کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں (البقرہ ۳۰-۳۳)

فرشتوں کا یہ قول اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر بظاہر ایک اعتراض تھا۔ مگر اللہ نے اس پر زجر و توبیخ نہیں کی۔ بلکہ انھیں اصل منصوبہ کی تفصیل بتائی۔ اس کے بعد ان کا اشکال اپنے آپ ختم ہو گیا۔ اور شبہ کی جگہ یقین واپس آ گیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے آغاز انسانیت میں خود اپنی ذات کمال سے یہ نمونہ قائم فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں اعتراض یا اشکال ظاہر کرے تو خود اعتراض پر اسے مطعون نہیں کیا جائے گا بلکہ اصل معاملہ کی وضاحت کی جائے گی تاکہ مکمل صورت حال سامنے آ جائے۔ گویا جو واقعہ آئندہ تاریخ میں انسانوں کے درمیان پیش آنے والا تھا، اس کو خدا اور فرشتوں کے درمیان واقع کر کے عملی طور پر بتا دیا گیا کہ اس طرح کے مواقع پر انسان کو کس قسم کا رویہ اپنانا چاہیے۔

اس واقعہ میں یہ بھی مثال ہے کہ جب معاملہ کی وضاحت کر دی جائے تو معترض کو فوراً اسے دل سے قبول کر لینا چاہیے۔ اس واقعہ میں ایک طرف اگر اعتراض کا نمونہ ہے تو دوسری طرف اس میں اعتراف کا بھی اعلیٰ نمونہ موجود ہے۔

پیغمبرؐ کی مثال

غزوۂ بدر کے ابتدائی واقعات میں سے ایک واقعہ ابن اسحاق نے اس طرح بیان کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر کرتے ہوئے تیزی سے بڑھے۔ آپ نے بدر کے قریب ایک چشمہ کے پاس پڑاؤ کیا۔ اس وقت الحباب بن المنذر بن الجموح نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، یہ مقام کیا ایسا ہے کہ یہاں اللہ نے آپ کو اتارا ہے جس میں ہمیں یہ اختیار نہیں کہ ہم اس سے آگے بڑھیں یا اس سے پیچھے ہٹیں۔ یا کہ یہ ایک رائے ہے اور جنگی تدبیر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ رائے اور جنگی تدبیر ہے (بل هو الرای والحرب والمکیدۃ)

انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، پھر تو یہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ نہیں (فان هذا لیس بمنزل) آپ یہاں سے روانہ ہو کر آگے چلئے۔ ہم لوگ اس چشمہ کے پاس اتریں جو قریش کے قریب ہے۔ اور پھر پیچھے جتنے پانی کے گڑھے ہیں، ان کو ناکارہ کر دیں۔ اور وہاں ایک حوض بنا کر اس کو پانی سے بھر لیں۔ پھر ان لوگوں سے جنگ کریں۔ تاکہ ہم پانی پئیں اور وہ نہ پئیں (فنشرب ولا یشربون) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ تم نے بہت ٹھیک رائے دی (لقد اشرت بالرأی)

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سب ساتھی اٹھ کر چلے۔ یہاں تک کہ جب قریش کے قریب ترین چشمہ کے پاس پہنچے تو وہاں اتر گئے۔ پھر دوسرے چشموں کے متعلق آپ نے حکم دیا تو وہ ناکارہ کر دیے گئے۔ جس چشمہ پر آپ اترے تھے اس پر حوض بنا کر اس کو پانی سے بھر لیا گیا (البدایۃ والنہایۃ ۳/۲۶۷)

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اظہار رائے کا کھلا ماحول ہوتا تھا۔ ایک شخص نے جب آپ کی رائے کے خلاف رائے دی تو اس کو برا نہیں مانا گیا اور نہ اس پر غصہ کیا گیا۔ اس کے برعکس صرف یہ پوچھا گیا کہ تمہاری مختلف رائے کیوں ہے۔ جب اس نے وضاحت کی تو معلوم ہوا کہ اس کی رائے درست تھی۔ چنانچہ اس کی تعریف کی گئی اور فوراً اس کو قبول کر لیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو اختلاف رائے کا موقع دینا اور اس کو سن کر اس سے فائدہ اٹھانا بھی پیغمبر کی سنتوں میں ایک سنت ہے۔

ابوبکر صدیقؓ کی مثال

الاقرع بن حابس التمیمی اور عُیینہ بن حصن الفزاری کا شمار مؤلفۃ القلوب میں ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حنین کی فتح کے دن ان میں سے ہر ایک کو تالیف قلب کے طور پر سو سو اونٹ دیے تھے (البدایہ والنہایہ ۷/۱۴۱) روایات میں آتا ہے کہ یہ اونٹ انھیں آپ نے ان کے قبول اسلام سے پہلے دیا۔

ابن ہمام نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کے زمانہ میں یہ دونوں صاحبان آپ کے پاس آئے۔ انھوں نے خلیفہ اول سے ایک زمین طلب کی۔ خلیفہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے پیش نظر مطلوبہ زمین انھیں دے دی اور ان کے کہنے پر اس کی ایک تحریر بھی لکھ کر ان کے حوالے کر دی۔

دونوں صاحبان تحریر لے کر باہر نکلے۔ حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ خلیفہ نے فلاں زمین ہمیں دے دی ہے۔ حضرت عمر نے تحریر ان سے لی اور اس کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا (فخرقہ عمر) حضرت عمر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی چیز تم کو پہلے دی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تم لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ لیکن اب اللہ نے اسلام کو عزت و طاقت دے دی ہے اور اس کو تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔ تم اسلام پر قائم رہو تو بہت اچھا ہے، ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہے۔

دونوں لوٹ کر دوبارہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور قصہ بتا کر کہا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر (الخلیفۃ انت (ام عمر) حضرت ابوبکر نے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو وہی خلیفہ ہیں۔ حضرت ابوبکر نے اس معاملہ میں حضرت عمر کی رائے سے اتفاق کیا۔ اور صحابہ میں سے کسی نے بھی اس پر نکیر نہیں کی (التفسیر المظہری، المجلد الرابع، صفحہ ۲۳۶)

اس واقعہ میں نہ صرف خلیفہ اول پر تنقید تھی بلکہ بظاہر ان کی توہین بھی تھی۔ مگر یہ واقعہ جب حضرت ابوبکر اور دوسرے صحابہ کے علم میں آیا تو انھوں نے ان ظاہری پہلوؤں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انھوں نے صرف یہ سوچا کہ باعتبار حقیقت حضرت عمر کی رائے درست ہے یا غیر درست۔ اور جب محسوس ہوا کہ اصولاً وہ بالکل درست ہے تو سب نے اس کو قبول کر لیا۔

عمر فاروقؓ کی مثال

حضرت عمر فاروق جب خلیفہ تھے، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں تمہاری ہی طرح ہوں اور تم لوگوں میں سے صرف ایک ہوں۔ اس لیے تم میرے خلاف جو بات بھی محسوس کرو اسے آزادانہ طور پر کہہ سکتے ہو۔ اس معاملہ میں تمہارے اوپر کوئی پابندی نہیں۔

ایک بار مدینہ کی مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر حضرت عمر لوگوں کے سامنے خطبہ دے رہے تھے، اس دوران انھوں نے کہا کہ میرے اندر اگر تم کوئی ٹیڑھ دیکھو تو اس وقت تم کیا کرو گے۔ ایک لمحہ خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد ایک شخص کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم، اگر ہم نے آپ کے اندر کوئی ٹیڑھ دیکھا تو اس کو ہم اپنی تلواروں سے سیدھا کر دیں گے (واللہ لو علمنا فیك اعوجاجا لقومناہ بسیوفنا)

اس کے بعد مسجد میں جو واقعہ پیش آیا وہ راوی کے الفاظ میں یہ تھا کہ حضرت عمر خوش ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے مسلمانوں میں ایسے افراد بنائے جو عمر کی ٹیڑھ کو اپنی تلوار سے سیدھا کر دیں گے (فحمد اللہ ان جعل فی المسلمین من یقوم اعوجاج عمر بسیفہ)

العبقریات الاسلامیۃ، صفحہ ۴۳۸

اسلام کے دوسرے خلیفۂ راشد کی یہ مثال بتاتی ہے کہ تنقید و اختلاف کوئی مبغوض چیز نہیں، بلکہ وہ انتہائی محبوب چیز ہے۔ حتی کہ ایک عام آدمی اگر خلیفۂ وقت کے خلاف غیر مودبانہ انداز میں بولے تب بھی اس کو خوش آمدید کہا جائے گا۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تنقید کے وقت ناقد کو نہ دیکھو، بلکہ اپنے آپ کو دیکھو۔ ناقد اگر تمہاری کسی غلطی کی نشاندہی کر رہا ہے تو وہ عین تمہاری بھلائی کا کام کر رہا ہے۔ ایسے اچھے کام کو صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اپنی بات کہنے کے لیے نامناسب اسلوب اختیار کیا تھا۔

خلیفۂ دوم کے اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ میں جو بڑے لوگ ہوں انھیں چاہیے کہ وہ آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کریں۔ حتی کہ خود اپنے آپ کو کھلی تنقید کے لیے پیش کریں۔ اور یہ پیش کرنا حقیقی طور پر ہو نہ کہ مصنوعی طور پر۔

عثمان غنیؓ کی مثال

حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح نے ایک روز حضرت عثمان سے بحث کی۔ انھوں نے کہا کہ میں
ین چیزوں میں آپ سے افضل ہوں۔ حضرت عثمان نے پوچھا کہ وہ کیا چیزیں ہیں۔ حضرت ابوعبیدہ
بن الجراح نے جواب دیا۔

اول یہ کہ بیعت رضوان (حدیبیہ) کے وقت میں حاضر تھا، اور آپ اس وقت غائب
تھے۔ دوسرے یہ کہ میں بدر کے غزوہ میں شریک ہوا اور آپ نے اس میں شرکت نہیں کی۔
تیسرے یہ کہ غزوۂ احد کے موقع پر میں ان لوگوں میں تھا جو ثابت قدم رہے اور آپ اس میں
ثابت قدم نہ رہ سکے۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت عثمان اس پر غصہ نہیں ہوئے بلکہ یہ بولے کہ آپ نے سچ کہا
(فلم یغضب عثمان ولکنہ قال لہ صدقت)

پھر اپنا عذر بیان کرتے ہوئے حضرت عثمان نے کہا کہ جہاں تک بیعت رضوان کا معاملہ
ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حاجت کے تحت مجھے مکہ بھیجا تھا۔ اور غزوۂ بدر میں
جو ہوا وہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی جگہ پر مدینہ میں مقرر فرمایا تھا۔ اور جہاں
تک غزوۂ احد میں میری پس پائی کی بات ہے تو اللہ نے مجھے میری اس کوتاہی کے لیے معاف کر دیا
(العبقریات الاسلامیہ، صفحہ ۵۷۱)

اس واقعہ میں حضرت عثمان پر براہ راست حملہ کیا گیا تھا۔ مذکورہ تینوں باتیں بظاہر ان کی
شخصیت کو سخت مجروح اور مشتبہ کر رہی تھیں۔ مگر حضرت عثمان اتنی سخت بات کو سن کر بھی غصہ
نہیں ہوئے۔ انھوں نے ٹھنڈے طریقہ سے کہا کہ بطور واقعہ آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔ پھر
اس اعتراف کے بعد انھوں نے تینوں واقعہ کے بارہ میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

تیسرے خلیفۂ راشد کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ انتہائی
سخت تنقید کو بھی ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سنا جائے۔ اپنے آپ کو اشتعال سے بچاتے ہوئے
سادہ طور پر اصل معاملہ کی وضاحت کی جائے۔

علی مرتضیٰؓ کی مثال

شورش پسند مسلمانوں کی ایک بھیڑ ۳۵ھ میں مدینہ میں داخل ہوئی اور اس نے خلیفہ سوم حضرت عثمان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اتنا خلفشار برپا ہوا کہ مدینہ پانچ روز تک خلیفہ سے خالی رہا۔ پھر حضرت علی بن ابی طالب کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی۔ تاہم مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ اس بیعت پر متفق نہ تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ پہلے عثمان کا خون کرنے والوں کو سزا دی جائے، اس کے بعد وہ خلیفہ چہارم کی اطاعت کریں گے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت علی یہ کہتے تھے کہ پہلے خلافت کے معاملہ کو مستحکم ہونے دو، اس کے بعد قاتلین کے خلاف ضروری کارروائی کی جائے گی۔

اس طرح مسلمانوں کے دو گروہ بن گئے۔ ایک حضرت علی کے ساتھیوں کا، اور دوسرا آپ کے مخالفوں کا۔ دونوں میں سخت اختلاف تھا، یہ اختلاف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ دونوں فریقوں کے درمیان جنگ کی نوبت آگئی۔

حضرت علی اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ سے بصرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کا اشتعال ختم ہو اور امت میں اتفاق پیدا ہو جائے۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر بصرہ والے آپ کی بات نہ مانیں تو آپ کیا کریں گے۔ حضرت علی نے کہا کہ ہم ان کو چھوڑے رہیں گے جب تک وہ ہم کو چھوڑے رہیں (ترکنا هم ما ترکونا) کہنے والے نے کہا کہ اگر وہ لوگ آپ کو نہ چھوڑیں اور جنگ پر آمادہ ہو جائیں تو پھر آپ کیا کریں گے۔ حضرت علی نے کہا کہ ہم مدافعت میں لڑیں گے۔ ابو سلام الدالانی نے کہا کہ ہمارا حال اور ان کا حال کیا ہوگا اگر کل کے دن ان سے ہمارا ٹکراؤ ہو جائے۔ حضرت علی نے جواب دیا کہ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارا یا ان کا جو آدمی بھی قتل ہوگا اور اس کا دل پاک ہوگا تو اللہ اس کو ضرور جنت میں داخل کرے گا (انی لارجوا ان لا یقتل منا ومنهم احد نقی قلبه للہ الا ادخله اللہ الجنة) البدایہ والنہایہ ۲۳۸/۷

خلیفہ چہارم کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اختلاف اتنا بڑھے کہ باہمی طور پر جنگ کی نوبت آجائے تب بھی مومن فریق ثانی کے بارہ میں اچھا ہی گمان رکھتا ہے۔ رائے کا اختلاف کسی بھی حال میں دل کے اختلاف یا بگاڑ کا سبب نہیں بنتا۔

ایک واقعہ

صحیح البخاری (کتاب العلم) میں انس بن مالکؓ کی ایک روایت ہے۔ وہ مدینہ کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس میں وہ خود موجود تھے۔ اس کا ابتدائی حصہ یہ ہے:

بَيْنما نحْنُ جلوسٌ معَ النبيِّ ﷺ في المسْجِدِ دَخَلَ رَجُل على جَمَل فَأَناخَهُ في المَسْجِدِ ثُمَّ عَقَلَهُ ثُمَّ قَال لهم: أيكُمْ محمدٌ - والنبيُّ ﷺ مُتكئٌ بَيْنَ ظَهْرانَيْهِمْ - فَقُلْنا: هَذا الرجلُ الأَبْيَضُ الْمُتَّكِئُ، فَقَالَ لَهُ الرجلُ: ابنَ عَبدِ المطَّلب. فَقالَ له النبيُّ ﷺ : قَدْ أَجَبْتُكَ: فَقَالَ الرجلُ للنبيِّ ﷺ : إني سَائِلُكَ فَمُشَدِّدٌ عَلَيْكَ فِي الْمَسْأَلةِ، فَلا تَجِدْ عليَّ فِي نَفْسِكَ. فَقَالَ: سَلْ عَمَّا بَدالَكَ. فَقَالَ: أسْأَلُكَ بِربِّكَ وَربِّ مَنْ قَبْلَكَ، آ اللهُ أَرْسَلَكَ إِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ؟ فَقَالَ: اللهُمَّ نَعم. الخ.

(فتح الباري بشرح صحيح البخاري ١٧٩/١)

ہم لوگ مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص اونٹ پر سوار ہو کر داخل ہوا۔ اس نے اپنا اونٹ مسجد میں بٹھایا، پھر اس نے اسے باندھا۔ پھر اس نے لوگوں سے پوچھا کہ تم میں محمدؐ کون ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ تکیہ لگائے ہوئے ہمارے سامنے بیٹھے تھے۔ ہم نے کہا کہ یہ سفید آدمی جو تکیہ لگائے ہوئے ہے۔ آنے والے نے کہا، اے عبدالمطلب کے بیٹے، آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہاری بات سن لی۔ اس نے کہا کہ میں آپ سے سوال کروں گا اور سوال میں آپ سے سختی کروں گا۔ آپ اپنے دل میں میرے اوپر غصہ نہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پوچھو جو تم پوچھنا چاہتے ہو۔ اس نے کہا کہ میں آپ کو آپ کے رب کی اور جو آپ سے پہلے تھے ان کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو سارے انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا، خدایا ہاں۔ الخ

پیغمبر اسلامؐ کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ہر ایک کو آزادی حاصل ہے کہ وہ بڑے سے بڑے آدمی سے بھی جو سوال چاہے کرے۔ حتی کہ وہ اپنے کلام میں سخت انداز اختیار کرنے کے لیے بھی آزاد ہے۔ مخاطب کو چاہیے کہ وہ سائل پر غصہ نہ ہو بلکہ ٹھنڈے طریقہ پر اس کے ہر سوال کا جواب دے۔

ظاہرداری نہیں

قرآن (المائدہ ۱۰۷) میں وراثت کا قانون بتاتے ہوئے ایک آیت یہ آئی ہے کہ :
من الذین استحق علیھم الاولیان (ان میں سے جن کا کہ حق دبا ہے جو سب سے قریب ہوں میت کے) اس آیت کے لفظ الاولیان کی قرأت میں اختلاف ہے۔ حسن نے اس کو الاوّلان پڑھا ہے، اور ابن سیرین نے اس کو الاوّلین پڑھا ہے (القرطبی ۶/۳۵۹)

ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت ابی بن کعب نے یہ آیت پڑھی اور الاولیان کی قرأت اپنے لحاظ سے کی جو کہ خلیفہ دوم عمر فاروق کی قرأت سے مختلف تھی، حضرت عمر نے اس کو سن کر کہا کہ تم نے جھوٹ کہا (کذبت) حضرت کعب نے جواب میں کہا کہ تم خود زیادہ بڑے جھوٹے ہو (انت اکذب) ایک شخص نے اس کو سن کر حضرت کعب سے کہا کہ تم امیر المومنین کو جھوٹا کہہ رہے ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں تم سے زیادہ امیر المومنین کے حق کی تعظیم کرتا ہوں۔ لیکن میں نے ان کو اللہ کی کتاب کی تصدیق کے معاملہ میں جھٹلایا ہے، میں نے اللہ کی کتاب کی تکذیب کے معاملہ میں امیر المومنین کی تصدیق نہیں کی۔ حضرت عمر فاروق نے کہا کہ انھوں نے ٹھیک کہا (حیاۃ الصحابہ ۲/۴۷ - ۷۵)

یہ گفتگو دو بڑے صحابی کے درمیان ہوئی۔ معترض صحابی نے ایسا نہیں کیا کہ وہ مختلف قرأت سن کر یہ کہتے کہ یا شیخ یا فضیلۃ الاستاذ، اسمح لی، لعلک اخطأت فی القرأۃ۔ بلکہ اپنی اندرونی کیفیت کے مطابق، بے تکلف ان کی زبان سے نکلا کہ کذبت (تم نے جھوٹ کہا)

اس واقعہ سے ایک اہم اصول اخذ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اظہار رائے کی آزادی کسی شرط کے بغیر ہونی چاہیے۔ شرط عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے دل میں کچھ ہو اور الفاظ کے ذریعہ اس کا اظہار وہ کچھ اور انداز میں کریں۔ یہ طرز کلام دھیرے دھیرے لوگوں کے اندر ظاہرداری پیدا کرے گا، اور ظاہرداری آخر کار ریاکاری کی صورت اختیار کرے گی۔

ایک بات جس کو آدمی حق سمجھے، فطری طور پر وہ اس کو بے کم و کاست ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس کے اوپر مصنوعی پابندی لگائی جائے تو وہ شدید تر نقصان کا باعث بن جائے گی۔ وہ لوگوں کے اندر دہرا شخصیت کی تشکیل کرے گی۔

سوال وجواب

حضرت علی بن ابی طالبؓ کی خلافت کے زمانہ میں مسلمانوں کا ایک طبقہ آپ کا باغی ہوگیا۔ اس نے زبردست خلفشار برپا کیا۔ دو لڑائیاں ہوئیں جن میں تقریباً چالیس ہزار مسلمان مارے گئے۔ حتی کہ خود حضرت علی کو شہید کر دیا گیا۔ اس خلفشار کے زمانہ میں آپ کے مخالف گروہ کا ایک آدمی آپ سے ملا۔ اس نے آپ سے کچھ ناقدانہ سوالات کیے۔ اس نے کہا کہ ایسا کیوں ہے کہ آپ کی خلافت کے زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اتنا اختلاف و انتشار پیدا ہوگیا۔ حالاں کہ ابوبکر و عمر خلیفہ تھے تو ان کے زمانہ میں اس طرح کے اختلافات برپا نہیں ہوئے۔ حضرت علی نے جواب دیا:

لِاَنَّ ابابکرٍ وعمرَ کانا والیین علیٰ مِثلی وانا الیوم والٍ علی مثلك۔	اس لیے کہ ابوبکر و عمر میرے جیسے لوگوں کے اوپر حاکم تھے اور میں آج تمہارے جیسے آدمی کے اوپر حاکم ہوں۔
(مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۲۱۱)	

اس اعتراض وجواب سے ایک اہم حقیقت واضح ہوکر سامنے آگئی۔ وہ یہ کہ صحیح اسلامی حکومت کے قائم ہونے کی سب سے اہم شرط کیا ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ سماج کے اندر واضح طور پر اس کے موافق حالات موجود ہوں۔ حضرت علی کے جواب کے الفاظ میں یہ کہنا درست ہوگا کہ صالح سیاسی نظام کے قیام کی شرط یہ ہے کہ ایک طرف صدر ریاست کی کرسی پر ابوبکر و عمر جیسا ایک فرد بیٹھا ہوا ہو، اور دوسری طرف معاشرہ پر اصحاب رسول جیسے لوگوں کا غلبہ ہو۔ خلافت مثل عمر کے ہاتھ میں ہو اور معاشرہ امثال علی پر مشتمل ہو۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے دور اول میں کس طرح یہ ماحول تھا کہ ایک عام آدمی وقت کے خلیفہ سے براہ راست ناقدانہ سوال کر سکتا تھا اور خلیفہ معتدل انداز میں اس کا جواب دیتا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب معاشرہ میں سوال وجواب کا کھلا ماحول ہو تو کس طرح الجھے ہوئے ذہنوں کی صفائی ہوتی ہے۔ کس طرح بڑے بڑے اشکالات کا حل خود متعلق شخصیتوں کے ذریعہ منقح ہوکر سامنے آجاتا ہے۔

حد بندی

طارق بن شہاب بیان کرتے ہیں کہ خالد بن الولید اور سعد بن ابی وقاصؓ کے درمیان ایک معاملہ میں اختلاف تھا، ان لوگوں کے درمیان اس پر بحث ہوتی تھی۔ مگر بہت دن تک دونوں کا اختلاف ختم نہیں ہوا۔

اس درمیان میں ایک شخص سعد بن ابی وقاص کے پاس آیا، اس نے حضرت سعد سے خالد بن الولید کی کچھ برائی بیان کی (مثلاً یہ کہ انھوں نے بہت دیر بعد اسلام قبول کیا اور غزوہ احد میں وہ مشرکین کی فوج کے سردار تھے) حضرت سعد نے مذکورہ شخص کی باتوں کو سن کر کہا کہ رک جا، ہمارے اور خالد کے درمیان جو اختلاف ہے وہ ہمارے دین پر اثر انداز نہیں ہوگا (مَہ، اِن ما بیننا لم یبلغ دیننا) حیاۃ الصحابہ ۲/ ۱۵م

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دو بڑے سے بڑے عالم یا بزرگ کے درمیان گہرا اختلاف ہو سکتا ہے۔ مگر عین اختلاف کے وقت بھی وہ سختی کے ساتھ اپنی حد پر رہے گا۔ وہ کسی حال میں بھی حد سے باہر نہیں جائے گا۔

یہ حد بندی دو اعتبار سے ہوگی۔ ایک تو یہ کہ دونوں جب اس معاملہ میں بحث و گفتگو کریں گے تو ان کا کلام شدت کے ساتھ صرف اختلافی نکتہ تک مرتکز رہے گا، وہ اصل اختلافی نکتہ سے اِدھر اُدھر منحرف نہیں ہوگا۔

دوسرے یہ کہ دونوں فریق کامل طور پر اس کا لحاظ رکھیں گے کہ ان کا اختلاف دماغی بحث کی سطح پر رہے، وہ اس سے آگے بڑھ کر دلوں کی کدورت نہ بننے پائے۔

"وہ ہمارے دین پر اثر انداز نہیں ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس اختلاف کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کی نیت پر شبہ کرنے لگیں۔ ہم ایک دوسرے پر اخلاقی نوعیت کا الزام لگانے لگیں۔ ہم ایک دوسرے کی شخصیت پر چوٹ کرنا شروع کر دیں۔ ہم دونوں کی بحث تمام تر دلائل پر چلے گی نہ کہ الزام تراشی اور عیب جوئی پر۔

اختلاف کے باوجود

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ راشد تھے۔ آخر عمر میں بعض جھوٹی خبروں کی بنا پر مصر کے ایک ہزار سے زیادہ آدمی مدینہ آئے۔ انھوں نے مدینہ پہونچ کر کافی شور وغل کیا اور آخر کار حضرت عثمان کے مکان کو گھیر لیا۔ اگرچہ حضرت عثمان کے خلاف ان کا الزام سراسر بے بنیاد تھا، مگر یہ مسلمان آپ سے اتنا برہم ہوئے کہ آپ کا گھر سے نکلنا اور گھر میں پانی جانا بند کر دیا۔ یہاں تک کہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ بوقت وفات آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔

حضرت عثمان کا محاصرہ تقریباً ۴۰ دن تک جاری رہا تھا۔ بلوائیوں نے جب حضرت عثمان کو گھیر لیا اور مکان سے نکلنے پر پابندی لگا دی تو آپ کے لیے مسجد جانا ممکن نہ رہا۔ خلیفہ کی حیثیت سے نمازوں کی امامت آپ ہی فرماتے تھے۔ جب آپ کا مسجد جانا بند ہو گیا تو بلوائیوں کا سردار غافقی بن حرب کی امام بن گیا۔ اس نے مدینہ کی مسجد میں نمازوں کی امامت شروع کر دی۔

یہ مدینہ کے مسلمانوں کے لیے بڑی سخت آزمائش کی بات تھی۔ ایک طرف وہ اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں، دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص جو کھلا ہوا مفسد اور غلط کار ہے، وہی مسجد کا امام بنا ہوا ہے۔ اس نازک حالت میں ایک شخص حضرت عثمان سے ملا اور ان سے پوچھا کہ ایسی حالت میں ہم کیا کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں یہ ہدایت فرمائی کہ تم لوگ اس کے پیچھے نماز ادا کرو۔ آپ نے فرمایا:

فإذا احسنَ الناسُ فأحسِن معهم وإذا اساؤا فاجتنب اساءتهم۔ (فتح الباری لشرح صحیح البخاری ۲/۲۲۱)

جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں تو اس میں ان کا ساتھ دو اور جب وہ لوگ کوئی برا کام کریں تو ان کی برائی سے دور رہو۔

خلیفہ راشد کے اس واقعہ میں عظیم الشان نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص سے ہمیں خواہ کتنی ہی زیادہ شکایت ہو، اس کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ انصاف پر قائم رہنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اختلاف کو حد کے اندر رکھنا چاہیے نہ یہ کہ اختلاف پیدا ہونے کے بعد ہم حد کے باہر نکل جائیں۔

صحت مند نتائج

سعید بن ابی عروبہ تابعی نے عالم کی تعریف کرتے ہوئے کہا جو آدمی اختلاف کو نہ سنے اس کو عالم نہ شمار کرو : من لم یسمع الاختلاف فلا تعدوہ عالماً (جامع بیان العلم وفضلہ، لابن عبدالبر، صفحہ ۴۹)

اختلاف سے مراد جھوٹی تنقید یا الزام تراشی والی باتیں نہیں ہیں۔ اختلاف سے مراد علمی اختلاف ہے۔ اور سنجیدہ علمی اختلاف اتنی قیمتی چیز ہے کہ جو حقیقی عالم ہوگا وہ اس کا حریص ہوگا نہ کہ وہ اس کو برا مانے اور اس کو بند کرنے کی کوشش کرے۔

علم اتنا زیادہ وسیع خزانہ ہے کہ وہ کسی ایک دماغ میں سما نہیں سکتا۔ اس لیے ہر سچا عالم حرص کی حد تک اس کا طالب رہتا ہے کہ کوئی ملے جو اس کی رائے سے اختلاف کرے۔ تاکہ علم کے نئے گوشے کھلیں، تاکہ دوسروں کے علم سے وہ اپنے علم میں اضافہ کرے۔

تاہم اختلاف اور مذاکرہ کا یہی فائدہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ مزید معلومات سامنے آتی ہیں جو دوسروں کے پاس ہیں۔ بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خود عالم کا اپنا ذہن زیادہ منقح ہوتا ہے۔ اختلاف و مذاکرہ کے دوران وہ خود اپنے خیالات کو زیادہ واضح اور جامع صورت میں مرتب کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک سچی علمی گفتگو، خواہ وہ کتنا ہی زیادہ اختلافی ہو، ایک صاحب علم اور حقیقت پسند شخص کے لیے لذیذ ترین تجربہ ہے۔ ایسا لمحہ گویا علم کے سمندر میں مشترکہ غوطہ زنی کے ہم معنی ہے۔ جو بے حد پر کیف بھی ہے اور بے حد مفید بھی۔

موجودہ زمانہ میں چونکہ جھوٹے ناقدین بہت بڑھ گئے ہیں اس لیے بہت سے لوگ سچی تنقید کو بھی برا سمجھنے لگے ہیں۔ حالاں کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جھوٹی تنقید اگر بدبو ہے تو سچی تنقید خوشبو، جھوٹی تنقید اگر کانٹا ہے تو سچی تنقید ایک حسین پھول۔

جھوٹی تنقید ایک قسم کی تخریب کاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں سچی تنقید ایک تعمیری عمل ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کو ہر حال میں جاری رکھا جائے۔

حریتِ فکر

مدینہ میں غلام طبقہ سے تعلق رکھنے والے ایک مرد اور ایک عورت رہتے تھے۔ مرد کا نام مغیث اور عورت کا نام بریرہ تھا، انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ایک عرصہ کے بعد خاتون آزاد ہوگئیں۔ آزادی کے بعد از روئے قاعدہ انھیں اختیار مل گیا کہ خواہ وہ سابق شوہر کے ساتھ رہیں یا اس سے علٰحدگی اختیار کرلیں۔ بریرہ نے علٰحدگی کا فیصلہ کیا۔ مگر مغیث کو اس خاتون سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ بریرہ اپنے فیصلہ کو بدل دیں اور ان کے ساتھ رہنے پر راضی ہوجائیں۔

یہ ایک لمبا قصہ ہے۔ حدیث کی کتابوں میں اس کی کافی تفصیلات آئی ہیں۔ حتیٰ کہ بریرہ اور مغیث پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ آخر کار ان کا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ بریرہ آگے آگے تھیں اور مغیث، جو سیاہ فام تھے، ان کے پیچھے اس طرح چل رہے تھے کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھی کے بال تر ہوگئے تھے۔ اس کے بعد ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں :

فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو راجعتہ۔ قالت یارسول اللہ تأمرنی۔ قال انما أنا اشفع۔ قالت لا حاجۃ لی فیہ۔ (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۹/۳۱۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اچھا ہے کہ تم اس کی طرف رجوع کرلو۔ بریرہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا آپ مجھے اس کا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں صرف سفارش کررہا ہوں۔ بریرہ نے جواب دیا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

یہ اس بات کی ایک انتہائی اعلیٰ اور آخری مثال ہے کہ اسلام میں عورت اور مرد کو کتنی زیادہ آزادی حاصل ہے۔ یہ آزادی کوئی سرکشی نہیں ہے۔ یہ انسانی فطرت کی رعایت ہے۔ انسان کی شخصیت کا ارتقاء صرف آزادی کے ماحول میں ہوسکتا ہے۔ جس طرح ایک درخت کھلی فضا ہی میں پروان چڑھتا ہے، ٹھیک اسی طرح ایک انسان کا ذہنی اور روحانی وجود صرف اسی وقت بھرپور طور پر نشو ونما پاتا ہے جب کہ اس کو کامل فکری آزادی ملی ہوئی ہو۔

حق کا اعتراف

خلیفہ ثانی عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ۱۶ھ میں عراق فتح ہوا۔ اس کے بعد یہ سوال تھا کہ دجلہ و فرات کے علاقہ کی زرخیز زمینیں جو مسلمانوں کے قبضہ میں آئی ہیں، ان کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ سابق رواج کے مطابق، فوجی سرداروں کی رائے یہ تھی کہ اس مفتوحہ زمین کا بڑا حصہ فوجیوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمر کی رائے اس کے خلاف تھی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ زمین کو سرکاری بیت المال کے زیر تصرف رہنا چاہیے تاکہ آئندہ نسلوں تک اس کا فائدہ تمام لوگوں کو مل سکے۔

اس مسئلہ پر سخت اختلاف ہوا اور کئی دن تک بحث جاری رہی۔ خاص طور پر خالد بن الولید، عبد الرحمٰن بن عوف اور بلال بن رباح نے اتنی زیادہ حجت کی کہ حضرت عمر فاروق کی زبان سے یہ الفاظ نکل آئے کہ: اَللّٰھُمَّ اکفنی بلالاً۔ یعنی اے اللہ، تو مجھ کو بلال سے نجات دے۔ اس کے بعد اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے ایک مشاورتی بورڈ بنایا گیا جس میں حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت طلحہ جیسے لوگ تھے۔ اس کے باوجود اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔

کئی دن کی بحث کے بعد آخر کار حضرت عمر کو قرآن کی یہ آیت یاد آئی کہ (غنیمت میں) ان مفلس مہاجروں کے لئے حصہ ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکالے گئے ہیں۔ وہ اللہ کا فضل اور رضامندی چاہتے ہیں۔ اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔ اور جو لوگ پہلے سے دار الاسلام میں قرار پکڑے ہوئے ہیں اور ایمان استوار کئے ہوئے ہیں، جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے وہ محبت کرتے ہیں، اور وہ اپنے دلوں میں اس سے تنگی نہیں پاتے جو مہاجرین کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ ان کے اوپر فاقہ ہو۔ اور جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو اُن کے بعد آئے (والذین جاؤا من بعدھم) الحشر ۸-۱۰

حضرت عمر فاروق نے لوگوں کو قرآن کی یہ آیت سنائی اور کہا کہ اس آیت میں غنیمت

اور فئی کا حکم بیان کرتے ہوئے والذین جاؤا من بعدھم (اور جو ان کے بعد آئے) کا لفظ ہے۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ فتوحات کے ذریعہ جو اموال ملیں وہ صرف حال کے لوگوں کے لئے نہیں ہیں بلکہ اس میں آنے والی نسلوں کا بھی حق ہے۔ اگر ان مفتوحہ زمینوں کو میں موجودہ فاتحین کے درمیان بانٹ دوں تو ہماری آئندہ نسلوں کو اس میں حصہ نہیں مل سکے گا۔ اور یہ قرآن کے منشاء کے خلاف ہوگا۔ حضرت عمر کے اس استدلال کو تمام لوگوں نے مان لیا اور ایک زبان ہو کر کہا کہ آپ ہی کی رائے درست ہے۔

اس کے بعد یہ اصول قائم ہو گیا کہ فتوحات کے ذریعہ جو زمینیں اسلامی مملکت میں داخل ہوں وہ حکومت اسلامی کی ملکیت قرار پائیں نہ یہ کہ فوج کے افراد میں تقسیم ہو کر ان کی انفرادی ملکیت میں چلی جائیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سورہ حشر کی مذکورہ آیت نے لوگوں کے ہونٹ سی دئے اور اب ان کے لئے کچھ بولنے کا موقع باقی نہ رہا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں میں قبولیت حق کا مادہ تھا۔ ان کی بحث نہ سمجھنے کی وجہ سے تھی نہ کہ محض سرکشی کی بنا پر۔ اس لئے جب قرآن کی آیت نے حقیقت کھول دی تو اس کے بعد ان کے لئے سمجھنا کچھ دشوار نہ رہا۔

اس دنیا میں بولنے کی گنجائش اتنی زیادہ ہے کہ آدمی ہر دلیل کے جواب میں اس کے خلاف بولنے کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ پا لیتا ہے۔ اب جو لوگ غیر سنجیدہ ہیں وہ اسی طرح ہر دلیل کے جواب میں الفاظ کا ایک مجموعہ پیش کر کے اسے رد کر دیتے ہیں۔ مگر جو لوگ سنجیدہ ہوں اور اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہوں۔ وہ نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات کسی بات کے مخالف بن جاتے ہیں۔ مگر جب اس بات کو زیادہ واضح دلائل سے ثابت کر دیا جائے تو وہ فوراً مان لیتے ہیں۔ اس کے بعد انھیں اصل بات کو ماننے میں کوئی الجھن پیش نہیں آتی۔

مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اظہار خیال کی آزادی کے آداب و قواعد کیا ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ایک عام آدمی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ خلیفۂ وقت سے اختلاف کرے۔ مگر اسی کے ساتھ آدمی کو ایسا ہونا چاہیے کہ جب دلیل سامنے آئے تو وہ اس کو پہچان سکے اور اس کے بعد اپنے اختلافات کو ختم کر دے۔

حق کی برتری

ایک عالم کا واقعہ ہے۔ انھوں نے ایک مسئلہ میں اپنے شیخ طریقت پر تنقید کی اور ان سے مختلف رائے دی۔ کسی شخص نے کہا کہ آپ اپنے شیخ سے اختلاف کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ شیخ ہم کو محبوب ہیں۔ مگر حق ہمیں شیخ سے بھی زیادہ محبوب ہے (الشیخ حبیب الینا ولکن الحق احب الینا من الشیخ)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اختلاف اور تنقید کے معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر آدمی کا حسب مراتب احترام کیا جائے گا۔ ہر ایک کے انسانی اور اخلاقی حقوق پوری طرح ادا کیے جائیں گے۔ مگر جب حق کا معاملہ سامنے آجائے تو حق کو سب سے زیادہ برتری حاصل ہوگی۔ انسان اور انسان کا مقابلہ ہو تو انسان اہم ہے۔ اور انسان اور حق کا مقابلہ ہو تو حق اہم ہے۔ حق کی اہمیت مطلق ہے اور انسان کی اہمیت مقید۔

انسان کے ساتھ سلوک کا معاملہ اخلاق کے تابع ہوتا ہے۔ مگر جب حق سامنے آجائے تو خود اخلاق بھی حق کے تابع ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس دنیا میں حق سے بڑی کوئی چیز نہیں۔ حق کی یہ اہمیت اس لیے ہے کہ حق اس دنیا میں خدا کا نمائندہ ہے۔ حق کا سامنے آنا گویا خدا کا سامنے آنا ہے۔ پھر جب خدا خود سامنے آجائے تو دوسری کون سی چیز ہوگی جو اس کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت رکھتی ہو۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو آدمی حق کا نام لے کر کھڑا ہو اس کو دوسروں کے اوپر لامحدود اختیار حاصل ہو جائے گا۔ اس معاملہ میں جو فضیلت ہے وہ نفس حق کے لیے ہے نہ کہ حق کا نام لینے والے کسی انسان کے لیے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق کا نام لے کر اٹھنے والے کسی فرد کو بھی اسی معیار سے جانچا جائے گا جس سے وہ دوسروں کو جانچنا چاہتا ہے۔ دونوں میں سے جو بھی حق کے معیار پر پورا نہ اترے وہ قابل ملامت ہے، اور اس کی بہترین سعادت یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف حق کے فیصلہ کو دل سے قبول کر لے۔ حق کا ظہور خدا کا ظہور ہے۔ مبارک ہے وہ جس کے سامنے حق ظاہر ہو اور وہ اس کو پہچان کر فوراً اس کے آگے جھک جائے۔

اضافۂ ایمان

ایمان کوئی جامد چیز نہیں اور نہ کسی مجموعۂ الفاظ کو زبان سے دُہرا لینے کا نام ایمان ہے۔ لفظی مجموعہ ایمان کی ظاہری علامت ہے نہ کہ خود لفظی مجموعہ ہی اصل ایمان ہے۔ تمام اعلیٰ حقیقتوں کی اہمیت ان کے معنوی پہلو کے اعتبار سے ہوتی ہے، پھر ایمان جیسی اعلیٰ ترین حقیقت کی اہمیت اس کے الفاظ تک کیوں کر محدود ہو جائے گی۔

ایمان حقیقتِ اعلیٰ کی دریافت ہے۔ ایمان علوم کے سرے کو پکڑنا ہے۔ ایمان معانی کے سمندر میں داخل ہونا ہے۔ ایمان اپنی محدودیت کو لامحدود کے درجہ تک لے جانا ہے۔ ایمان زمینی پستیوں سے اٹھ کر آسمانی بلندیوں تک پہنچ جانا ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی ایک ایسے روحانی سفر کا مسافر بن جائے جہاں ہر آن نیا تجربہ ہے۔ وہ ایک ایسا شعوری ارتقاء ہے جس کا سلسلہ کبھی اور کہیں ختم نہیں ہوتا۔ چنانچہ قرآن میں ایمان کو ایک ارتقاء پذیر حقیقت بتایا گیا ہے، ایک ایسا قلبی سرمایہ جس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے (الفتح ۴) ایمان ایک اعلیٰ ترین علم ہے جو ہمیشہ اللہ کی توفیق سے بڑھتا رہتا ہے۔

ایمان میں یہ زیادتی کس طرح ہوتی ہے۔ اس کا پہلا ذریعہ تفکر و تدبر ہے۔ انسان خدا کی باتوں کو پڑھتا ہے۔ وہ خدا کی چیزوں میں غور کرتا ہے (آل عمران ۱۹۱) اس طرح حق و صداقت کی نئی نئی تجلیاں اس پر منکشف ہوتی ہیں۔ پھر وہ اہل ذوق کے ساتھ ان پر مذاکرہ کرتا ہے، جیسا کہ عمر فاروق ؓ نے کہا: تعالی نؤمن ساعة، هلم فلنذكر ربنا۔ اس طرح فکری تبادلہ کے ذریعہ ہر ایک اپنے علم کو بڑھاتا ہے۔ ہر ایک اپنی معرفت میں اضافہ کرتا ہے۔

فکری ارتقاء کے اس عمل کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلم معاشرہ میں آزادانہ تبادلۂ خیال کا ماحول ہو۔ لوگ کھلے طور پر اپنی بات کو کہیں اور دوسرے کے تبصرہ کو سنیں۔ کہنے والے کو آزادانہ طور پر اپنے دل کی بات کہنے کا موقع ہو اور سننے والوں میں یہ حوصلہ ہو کہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ اس کو سنیں۔ اس طرح تبادلۂ افکار کے ذریعہ شعورِ ایمان کا ارتقائی سفر مسلسل جاری رہے۔ اضافۂ ایمان خلا میں نہیں ہوتا بلکہ افکار کے طوفانوں کے درمیان ہوتا ہے۔

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ تم یہ دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب، میرا علم زیادہ کر دے:
وقل ربّ زدنی علماً (طٰہٰ ۱۱۴) اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ربّ زدنی علماً کا مطلب ہے ربّ زدنی فہماً (القرطبی ۱۱/۲۵۰) یعنی میرے فہم دین میں اضافہ کر دے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فہم دین یا علم دین ایک ایسی چیز ہے جس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ معلومات کے اعتبار سے بھی اور بصیرت و معرفت کے اعتبار سے بھی۔

یہ اضافہ بلاشبہ اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ مگر اس عالم امتحان کے لیے اللہ کا قانون یہ ہے کہ یہاں ہر ملنے والی چیز حالات و اسباب کے درمیان ملتی ہے۔ اسی طرح دین کا علم و فہم بھی آدمی کو حالات و اسباب کے درمیان حاصل ہوتا ہے۔

انھیں حالات و اسباب میں سے ایک چیز یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اپنے ذہن کی کھڑکیوں کو کھلا رکھے۔ وہ اضافۂ علم کے لیے مسلسل حریص بنا رہے۔ مطالعہ، مشاہدہ اور مذاکرہ جیسی چیزوں میں برابر مشغول رہے۔ دوسروں سے سیکھنے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا ہو۔ جب بھی کسی صاحب علم یا صاحب ذوق سے اس کا ٹکراؤ ہو تو انا کے خول سے باہر نکل کر وہ اس کی باتوں کو سنے اور ذاتی وقار کے احساس سے بلند ہو کر اس سے استفادہ کرے۔

علم میں اضافہ کا براہ راست تعلق طلب میں اضافہ سے ہے۔ بڑھی ہوئی طلب والا ایک آدمی ہی اپنے علم و فہم میں اضافہ کرتا ہے۔ اور طلب کی پہچان یہ ہے کہ آدمی کی کیفیت یہ ہو جائے کہ علم جہاں بھی ملے وہ اس کو لے لے، خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔

ہر علم تبادلہ کے ذریعہ بڑھتا ہے، اسی طرح ربانی علم بھی اس دنیا میں تبادلہ کے ذریعہ مسلسل بڑھتا رہتا ہے، مذاکرہ، تبادلۂ افکار، ایک دوسرے کے بارہ میں اظہار خیال، ایک دوسرے کو اپنی روحانی دریافتیں بتانا اور ان پر اہل ذوق کا تبصرہ سننا، یہ سب وہ ذریعے ہیں جو فہم دین میں اضافہ کرتے ہیں، اور وہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ماحول میں آزادانہ طور پر افکار و تجربات کا لین دین جاری رہے۔

علم میں اضافہ کی دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے خود اپنی داخلی تڑپ کا ایک دعائیہ اظہار ہے نہ کہ متعین قسم کے خارجی الفاظ کی کوئی لسانی تکرار۔

بے جا غلو

قرآن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ امید ہے کہ تمہارا رب تم کو مقام محمود پر کھڑا کرے (عسی ان یبعثك ربك مقاما محمودا) الاسراء ۷۹

بغداد میں ۳۱۷ھ میں اس آیت پر دو مسلم گروہوں کے درمیان بحث ہوئی۔ ایک طرف ابو بکر المروذی الحنبلی کے اصحاب تھے، اور دوسری طرف عوام کا ایک طبقہ۔ حنابلہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ قیامت کے دن آپؐ کو عرش کے اوپر بٹھائے گا۔ دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ اس سے مراد شفاعت عظمیٰ ہے۔ یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ دونوں گروہوں میں باقاعدہ جنگ ہوگئی جس میں بہت سے لوگ ہلاک ہوگئے (البدایہ والنہایہ ۱۱/۱۶۲)

اس قسم کے واقعات پہلے بھی بار بار پیش آئے اور آج بھی ایسے واقعات کثرت سے پیش آرہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر کچھ لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ بحث و اختلاف بذاتِ خود غلط ہے۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ وہ صرف مقلد بن کر رہیں۔ کسی بھی قسم کی اختلافی بحث میں نہ پڑیں۔ یہ مشورہ ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہے۔ مشورہ دینے والوں کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو اختلاف کا صحیح طریقہ بتائیں نہ یہ کہ خود اختلاف کو بند کرنے کا مطالبہ کریں۔

مذکورہ افسوس ناک واقعہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے علمی اختلاف اور جنگی ٹکراؤ کے فرق کو نہیں سمجھا۔ علمی اختلاف کا اول و آخر ہتھیار دلیل ہے، اور جنگی ٹکراؤ کا ہتھیار تلوار اور بندوق ہے۔ اگر جنگی ٹکراؤ پیش آجائے تو متشددانہ اسلحہ کا استعمال ایک ناگزیر ضرورت ہوگا۔ کیوں کہ جنگی ٹکراؤ میں فیصلہ کن چیز ہمیشہ ہتھیار ہی رہا ہے۔

مگر علمی اختلاف کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ اس میں ہتھیاروں کا استعمال صرف ایک قسم کا پاگل پن ہے۔ کیوں کہ علمی اختلاف میں اصل اہمیت کی چیز دلیل ہوتی ہے نہ کہ تشدد۔ فریق ثانی اگر ایک دلیل کو نہیں مانتا تو اس کے سامنے دوسری دلیل پیش کیجئے۔ دوسری دلیل سے بھی مطمئن نہیں ہوتا تو تیسری اور چوتھی دلیل پیش کیجئے۔ علمی بحث میں ہمیشہ صرف دلیل پیش کی جائے گی، خواہ کوئی اسے مانے یا ماننے سے انکار کردے۔

مذکورہ واقعہ سے جو چیز غلط یا قابل ترک قرار پاتی ہے وہ تنقید اور اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ غلو اور شدت پسندی ہے، اور غلو ہر معاملہ میں برا ہوتا ہے۔

تنقید کو بند کرو، اختلاف رائے کو ختم کرو، تاکہ امت میں اتحاد ہو سکے ——— یہ جملہ قواعد کے اعتبار سے درست ہے، مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ہے۔ کیوں کہ تنقید و اختلاف انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے، اس لئے وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ زیادہ صحیح اور قابل عمل بات یہ ہے کہ تنقید کو گوارا کرو، اختلاف رائے کو برداشت کرو تاکہ امت میں اتحاد ہو سکے۔ کسی قوم میں اتحاد ہمیشہ اسی دوسرے اصول کی بنیاد پر ہوتا ہے، اور امت مسلمہ میں بھی اتحاد اسی بنیاد پر ہوگا۔ اس کے سوا اتحاد کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

صحابہ و تابعین کے درمیان اختلافات تھے، اسی طرح محدثین، فقہاء، علماء، صوفیاء سب کے درمیان کثرت سے اختلافات تھے۔ حتی کہ قرآن سے ثابت ہے کہ دنیا میں بیک وقت دو پیغمبر ہوں تو ان کے درمیان بھی کبھی اختلاف ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اختلاف کو ختم کر کے اتحاد قائم کرنے کی شرط نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ وہ غیر شرعی بھی ہے۔

تنقید و اختلاف کوئی برائی نہیں۔ وہ فکری ارتقاء کا ذریعہ بنتی ہے۔ مثال کے طور پر غزوۂ بدر کے موقع پر ایک صحابی نے پیغمبر سے اختلاف کیا۔ اس کے نتیجہ میں زیادہ بہتر میدان جنگ کا انتخاب ممکن ہو گیا۔ وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک طالب خویش اور دوسرا طالب حق۔ طالب خویش اپنی ذات میں جیتا ہے۔ اس کی ساری دل چسپی اس میں ہوتی ہے کہ اس کی اپنی شخصیت نمایاں ہو۔ اس کی بڑائی تسلیم کی جائے۔ یہی وہ آدمی ہے جو تنقید و اختلاف سے بھڑکتا ہے۔ کیوں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ تنقید اس کی شخصی عظمت کو گھٹا رہی ہے۔

طالب حق کی نفسیات اس سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ وہ صرف حق کا طالب ہوتا ہے۔ وہ تنقید کو اپنی ذات پر حملہ نہیں سمجھتا۔ وہ تنقید کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ حق ہے یا ناحق۔ تنقید اگر غلط ہے تو وہ سادہ طور پر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن تنقید اگر برحق ہے تو وہ فوراً اس کو قبول کر لے گا۔ کیونکہ ایسی تنقید میں اس کو عین وہی چیز ملتی ہوئی نظر آئی جو پہلے سے اس کا مطلوب و مقصود تھی۔

جارحیت نہیں

خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس لیے انسان خود اپنی فطرت کے تحت یہ چاہتا ہے کہ وہ آزادانہ طور پر سوچے اور آزادانہ طور پر اظہار خیال کرے۔ انسانی فطرت کی یہ ایسی خصوصیت ہے جس کو کسی طرح بھی انسان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان ایک منفرد وجود ہے۔ ہر انسان کا طرز فکر دوسرے تمام انسانوں سے جدا ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک ڈھنگ پر سوچنے لگیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اختلاف ایک تقاضائے فطرت ہے، ایسی حالت میں انسانوں کے درمیان اختلاف کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ انسان کے بارہ میں صحیح اور ممکن رویہ صرف یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ میں تحمل کا طریقہ اختیار کریں۔ اس دنیا میں جو شخص جتنا زیادہ متحمل ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ کامیاب ہوگا۔

مورخین اسلام اس پر متفق ہیں کہ عملی اعتبار سے حضرت امیر معاویہؓ ایک نہایت کامیاب حکمراں تھے۔ ان کی کامیابی کا راز یہ نہیں تھا کہ انھوں نے اپنی زیر حکم دنیا میں اختلاف کو مٹا دیا تھا۔ اس کے بجائے ان کی کامیابی کا راز وہ تھا جس کو ایک مورخ نے "الحلم السیاسی" کا نام دیا ہے۔ وہ انتہائی غیر موافق بات کو انتہائی تحمل کے ساتھ سن سکتے تھے۔ ابن قتیبہ نے ان کا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

اغلظ رجل لمعاویة فحلم عنه۔ فقیل له، تحلم عن هذا۔ فقال انی لا احول بین الناس وبین السنتهم مالم یحولوا بیننا وبین سلطاننا

(عیون الاخبار ۱/۲۸۳)

ایک شخص نے امیر معاویہ سے سخت کلامی کی۔ انھوں نے اس سے درگزر کیا۔ ان سے کہا گیا کہ آپ ایسے آدمی سے درگزر کا معاملہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں لوگوں کے درمیان اور ان کی زبان کے درمیان حائل نہیں ہوتا جب تک وہ ہمارے درمیان اور ہماری سلطنت کے درمیان حائل نہ ہوں۔

اس تحمل کا تعلق صرف سلطنت یا سیاسی اقتدار سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ ہر آدمی کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے، خواہ وہ سیاسی دائرہ میں ہو یا غیر سیاسی دائرہ میں، آپ انسان کی اس دنیا کو ٹھوکر نہ ماریں۔ بلکہ اپنا اختلاف تمام تر صرف دلائل پیش کرنے تک محدود رکھیں، اگر آپ ایسا کریں تو معاشرہ میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔ البتہ اختلاف اس وقت خلل اندازی کے ہم معنی بن جاتا ہے جب آپ آدمی کی اپنی مخصوص دنیا کے ساتھ تصادم چھیڑ دیں۔

اختلاف کا صحیح اور فطری اصول یہ ہے کہ اختلاف کو صرف اختلاف کے دائرہ میں رکھا جائے، اس کو تصادم یا عملی جارحیت کے درجہ تک ہرگز پہنچنے نہ دیا جائے۔

ایک حاکم کے لیے عملی جارحیت یہ ہے کہ اختلاف کرنے والا نظری اختلاف کی حد سے گزر کر اس کے اقتدار سے ٹکرانا شروع کر دے۔ وہ اس کے قلب و دماغ کو مخاطب کرنے کے بجائے اس کے سیاسی وجود کو مٹانے پر تل جائے۔

ایک عام انسان کے لیے عملی جارحیت یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ اختلاف کی حد پر نہ رکے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ زیر اختلاف شخص کی ذات کو مطعون کرنے لگے۔ وہ اس کی تذلیل و تحقیر کرے۔ وہ اس کو بدنام کرنے کی مہم چلائے۔ اس کی حیثیت عرفی کو بگاڑنے کی کوشش کرے۔ لوگوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کرے۔ اس کے اخلاقی قتل کی مہم چلائے۔ سازشی منصوبہ کے ذریعہ وہ اس کی تدبیر کرے کہ اس کے سماجی تعلقات ٹوٹ جائیں اور وہ اپنے ماحول میں اکیلا ہو کر رہ جائے۔

عملی جارحیت کیا ہے، اس کا تعین ہر آدمی کے اپنے حالات کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ اصولی طور پر عملی جارحیت یہ ہے کہ آدمی کے دماغ سے اپیل کرنے کے بجائے خود اس کے وجود سے تصادم شروع کر دیا جائے۔ اس کو سنجیدہ دلائل سے قائل کرنے کے بجائے غیر سنجیدہ طریقوں سے اسے زیر کرنے کی کوشش کی جائے۔

آزادی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ مگر اس حق کو استعمال کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی آزادی کو تشدد اور جارحیت تک نہ لے جائے۔

مشترک ذمہ داری

ابن ماجہ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ بابرکت ہے وہ بندہ جس کو اللہ نے بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا بنایا (فطوبیٰ لعبد جعلہ اللہ مفتاحاً للخیر مغلاقاً للشر)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سچے اسلامی معاشرہ میں لوگ کس احساس کو لے کر جیتے ہیں۔ ایسے معاشرہ میں ہر آدمی اس احساس کے تحت جی رہا ہوتا ہے کہ معاشرہ کے احوال میں اسے غیر جانب دار نہیں رہنا ہے بلکہ ہر موقع پر اپنا اصلاحی کردار ادا کرنا ہے۔ جہاں اس کو نظر آئے کہ وہ ایک بھلائی کی روایت قائم کر سکتا ہے تو فوراً وہ اس کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔ اسی طرح جہاں اس کو دکھائی دے کہ ایک شر جنم لے رہا ہے تو فوراً وہ اس کو روکنے کے لیے کمربستہ ہو جائے گا۔ خیر کا راستہ کھولنا اور شر کا دروازہ بند کرنا ایمان کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔

اسلام کا یہ مطلوب اصلاحی عمل کسی ایسے معاشرہ ہی میں انجام دیا جا سکتا ہے جہاں تنقید کو برا نہ سمجھا جاتا ہو۔ جہاں باتوں کو اس لحاظ سے نہ دیکھا جائے کہ وہ کس کے موافق ہے اور کس کے خلاف۔ اس کی وجہ سے کس کی شخصیت اونچی ہوتی ہے اور کس کی شخصیت نیچی۔ حتی کہ کلام کے اس پہلو کو بھی نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ نرم الفاظ میں ہے یا سخت الفاظ میں۔ معاشرہ میں جب تک اس قسم کا آزادانہ ماحول نہ ہو، کسی کے لیے مذکورہ مومنانہ عمل انجام دینا ممکن ہی نہیں۔

کسی معاشرہ میں اس روح کا پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس معاشرہ کے افراد صرف اپنے لیے نہیں سوچتے بلکہ دوسروں کے لیے بھی سوچتے ہیں۔ ان کے اندر اعلیٰ انسانی اور اخلاقی احساسات زندہ ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے بارہ میں انتہائی سنجیدہ ہیں۔ وہ حق کے لیے کسی اور کی رعایت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے دل میں ہر ایک کے لیے خیر خواہی کا جذبہ موجود ہے۔ وہ مجموعی انسانیت کا فائدہ چاہتے ہیں نہ کہ صرف اپنا یا اپنی ذات کا فائدہ۔ تاہم یہ نیکی صرف ان لوگوں کا مقدر ہے جو اظہار حق کے ساتھ قبولیتِ حق کا مادہ بھی اپنے اندر رکھتے ہوں۔

بھلائی کا دروازہ کھولنا اور برائی کا دروازہ بند کرنا، یہ کوئی یک طرفہ عمل نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ کسی فرد یا گروہ کو خدائی لائسنس دے دیا گیا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کا احتساب کریں اور دوسروں کو ان کا احتساب کرنے کا حق نہ ہو۔ بلکہ یہ دو طرفہ عمل ہے، اور معاشرہ کے سبھی لوگوں کی طرف سے سبھی لوگوں کے اوپر جاری رہتا ہے۔

اسی لیے قرآن و حدیث میں اس کے لیے وہ صیغے استعمال کیے گئے ہیں جن میں دو طرفہ مشارکت کا مفہوم ہے۔ مثلاً فرمایا کہ وتواصوا بالحق (العصر) یعنی ایک دوسرے کو باہم حق کی نصیحت کرو۔ اسی طرح فرمایا کہ کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ (المائدہ ۷۹) یعنی وہ بگاڑ کے وقت ایک دوسرے کو برے کام سے روکتے نہیں تھے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ بل ائتمروا بالمعروف و تناھوا عن المنکر (سنن ابی داؤد) یعنی تم آپس میں ایک دوسرے کو معروف کی تلقین کرو اور آپس میں ایک دوسرے کو برائی سے روکو۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضؓ کے بہت سے واقعات اس سلسلہ میں سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثلاً متعدد بار ایسا ہوا کہ انھوں نے ایک حکم جاری کیا۔ ایک شخص نے شرعی دلیل کے ساتھ بتایا کہ آپ کا حکم درست نہیں۔ اس کے بعد فوراً انھوں نے اپنا حکم واپس لے لیا اور کہا کہ لولا فلانی لھلک عمر (اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا) ایک مرتبہ حضرت عمر رات کے گشت پر نکلے۔ دیکھا کہ ایک آدمی شہر کے باہر کھڑا ہوا ایک عورت سے بات کر رہا ہے۔ انھوں نے اس کو کوڑا مار دیا۔ اس نے کہا کہ آپ نے کیوں مجھے کوڑا مارا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم رات کے وقت ایک اجنبی عورت سے بات کر رہے ہو۔ اس نے بتایا کہ یہ اجنبی عورت نہیں ہے، یہ میری بیوی ہے۔ ہم دونوں باہر سے آکر ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ ہم مشورہ کر رہے تھے کہ اس وقت شہر میں کس کے گھر جائیں حضرت عمر نے فوراً کوڑا مذکورہ آدمی کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا کہ اب تم مجھے کوڑا مارو، کیوں کہ اس معاملہ میں اصل غلطی میری تھی۔

یہی ہمیشہ تمام صالحین کا معاملہ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی اپنے خلاف تنقید سننے کے لیے تیار نہ ہو، اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ دوسروں کے اوپر تنقید کرے۔ اسلام میں اختلاف اور محاسبہ کا حق ایک مشترک حق ہے نہ کہ کسی ایک کا مخصوص حق۔

آزادی کی حد

فکری آزادی بلاشبہ کسی انسان کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ مگر اس دنیا میں ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، اسی طرح آزادی کی بھی حد ہے۔ آزادی اپنی حد کے اندر نعمت ہی نعمت ہے۔ مگر اپنی حد کے باہر وہ فساد ہی فساد ہے۔

فکری آزادی کی حد یہ ہے کہ وہ معلوم اور ثابت شدہ حقیقتوں کے دائرہ میں جاری ہو، مفروضات اور قیاسات کی بنیاد پر نہ کوئی رائے قائم کی جائے اور نہ اس قسم کی بے اصل باتوں کو لے کر کوئی نظریاتی عمارت کھڑی کی جائے۔ قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ ——— اور تم ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کی تم کو خبر نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل سب کی بابت آدمی سے پوچھ ہوگی (الاسراء ۳۶) اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو غیر ذمہ دارانہ کلام سے بچنا چاہیے۔ اس کو وہی بات بولنا چاہیے جس کی بابت سننے اور دیکھنے اور سمجھنے کی طاقتوں کو بھرپور طور پر استعمال کر کے وہ اس کی تحقیق کر چکا ہو۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اس بات کا مجرم قرار دیا جائے گا کہ خدا کی دی ہوئی ضروری صلاحیتوں کو استعمال کیے بغیر بالکل بے بنیاد طور پر اس نے اظہار خیال کرنا شروع کر دیا۔

آدمی اگر کسی شخص کے خلاف یا کسی مسئلہ کے بارہ میں کلام کرنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی پوری تحقیق کرے۔ وہ اظہار خیال سے پہلے پوری طرح اس کی جانچ کرے۔ اور پھر وہ صرف اس وقت بولے جب کہ اس کے پاس بولنے کے لیے کوئی محکم بات ہو، بصورت دیگر اس پر فرض ہے کہ وہ خاموشی کا طریقہ اختیار کرے۔

بولنا اس آدمی کے لیے جائز ہے جو بولنے سے پہلے اس کی تیاری کرے۔ وہ اپنے آپ کو بولنے کا اہل بنائے۔ سنی سنائی باتوں پر رائے دینا اتنا برا ہے کہ حدیث میں اس کو جھوٹ کہا گیا ہے۔ اسی طرح نیت سے تعلق رکھنے والی باتوں کو زیر بحث لانا سخت گناہ ہے۔ کیوں کہ اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ آزادانہ اظہار رائے جس طرح ایک حق ہے اسی طرح وہ ایک ذمہ داری بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ کامل واقفیت کے بغیر آدمی کبھی اظہار رائے نہ کرے۔

قتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ اور عمرؓ مکہ اور منیٰ میں قصر کر کے دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ عثمانؓ نے بھی اپنی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد عثمانؓ نے قصر نہیں کیا بلکہ چار رکعت نماز پڑھی۔ عبداللہ بن مسعودؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور اس کو غلط بتایا۔ اس کے بعد وہ اٹھے اور چار رکعت نماز ادا کی۔ ان سے کہا گیا کہ چار رکعت نماز پر آپ نے انا للہ وانا الیہ راجعون کہا اور پھر خود بھی آپ نے خلیفہ کی پیروی میں چار رکعت نماز پڑھی۔ انھوں نے جواب دیا کہ خلاف کرنا زیادہ برا ہے (الخلاف شر) حیاۃ الصحابہ ۲/۹

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ مثال ایک اہم حقیقت کو بتاتی ہے۔ اور وہ ایک فرق ہے جس کو اس طرح کے اختلافی معاملہ میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ اختلافی معاملہ میں بولنے کے وقت تو اصل معیار کو سامنے رکھا جائے گا۔ مگر عمل کرنے کے معاملہ میں عملی پہلوؤں کی رعایت کی جائے گی۔

آزادی ہر فرد کا ایک حق ہے۔ مگر ہر حق کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح آزادی کے حق کے ساتھ بھی کچھ لازمی ذمہ داریاں وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے اس حق کو استعمال کرنے سے پہلے بار بار یہ سوچے کہ اس کا بولنا نتیجہ کے اعتبار سے کیسا ثابت ہوگا وہ تعمیری نتیجہ پیدا کرے گا یا تخریبی نتیجہ۔

اسی طرح یہ بھی ایک ذمہ داری ہے کہ اجتماعی نظام میں اجتماعی فیصلہ کی پیروی کی جائے۔ جس آدمی کے ہاتھ میں اجتماعی معاملہ کا نظم نہ ہو، وہ زبانی طور پر اپنا اختلاف ظاہر کر سکتا ہے، مگر عملی اعتبار سے اس کو وہی کرنا چاہیے جو دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اجتماعی اتحاد ٹوٹ جائے گا، اور اجتماعی اتحاد کا ٹوٹنا تمام برائیوں میں سب سے بڑی برائی ہے۔

حدیث میں ہے کہ فعلیکم بالسواد الاعظم (ابن ماجہ، کتاب الفتن) یعنی سواد اعظم کی پیروی کرو۔ اس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے۔ یعنی جب فتنہ کی حالت ہو اور صورت حال پر تمہارا کنٹرول قائم نہ رہے تو تم قول کی حد تک حکیمانہ انداز میں حق کا اعلان کر سکتے ہو۔ مگر عمل کے معاملہ میں تمہیں مسلمانوں کے سواد اعظم کے ساتھ رہنا چاہیے۔ کیوں کہ ایسی حالت میں عملی اختلاف زیادہ بڑی برائی کا سبب بن جائے گا۔

اختلافات کی توجیہہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے ——— کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا
ں اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بہت اختلاف پاتے (النساء ۸۲)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ نے جو دین اسلام بھیجا ہے وہ ایک ایسا دین ہے
ں میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہی بات حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ میں نے تم کو ایک روشن
ن پر چھوڑا ہے، اس کی راتیں بھی اس کے دنوں کی طرح ہیں (لقد ترکتکم علی مثل البیضاء
لہا کنہارہا) ابن ماجہ، مقدمہ

مگر ایک شخص جب قرآن کی تفسیروں اور حدیث کی شرحوں کو پڑھتا ہے۔ جب وہ فقہ
رعقائد کی کتابوں کو دیکھتا ہے تو بظاہر بالکل برعکس تصویر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں وہ اتنے زیادہ
تلافات دیکھتا ہے کہ شاید اسلام کی کوئی ایک تعلیم بھی نہیں جس میں علماء کے درمیان کثرت سے
لاف نہ پایا جاتا ہو۔ یہاں دین اسلام بظاہر دین اختلاف معلوم ہونے لگتا ہے۔

ایک دار العلوم کے شیخ الحدیث نے کہا کہ شوال کے مہینہ میں حدیث کے اسباق کی بسم اللہ
تی ہے اور رجب میں اس کی تمت ہوتی ہے۔ ان دس مہینوں میں اسباق کا کوئی دن بھی
ا نہیں گزرتا جس میں کم از کم بیس مرتبہ یہ نہ کہنا پڑتا ہو کہ اس مسئلہ میں فلاں امام کا یہ مذہب ہے
رفلاں کا یہ مختلف مذہب ہے۔ صحابہ کا یہ مذہب تھا، تابعین میں یہ اختلاف ہے اور یہ کہ رأینا
واب و رائی غیرنا خطأ (ہماری رائے درست ہے اور دوسروں کی رائے خطا ہے)

ایک بے اختلاف دین یا اختلاف دین کیوں بن گیا۔ اور اس معاملہ کی اطمینان بخش
یہہ کیا ہے۔ اس پر پچھلے ہزار برس کے دوران بہت لکھا گیا ہے اور بہت کچھ کہا گیا ہے۔ آج
ں اس کے بارہ میں کثرت سے مضامین اور کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔

یہ سوال ابتدائی طور پر صحابہ کے زمانہ ہی میں موجود تھا۔ تاہم باقاعدہ صورت میں
تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں نمایاں ہوا۔ جب حدیثیں اکٹھا کی گئیں تو معلوم ہوا کہ
د روایات میں کثرت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اب لوگوں نے یہ سوال کرنا

شروع کیا کہ کس روایت کی پیروی کریں اور کس روایت کی پیروی نہ کریں۔
اس وقت ابتداءً یہ نقطۂ نظر اختیار کیا گیا کہ یہ مختلف روایتیں تو خود صحابہ سے مل رہی ہ
اور صحابہ سب کے سب قابل تقلید ہیں۔ پھر ہم کیوں کر ایسا کہہ سکتے ہیں کہ اِس صحابی کی روایت
مانو اور اُس صحابی کی روایت کو نہ مانو۔
محمد بن عبدالرحمٰن الصیرفی کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے پوچھا کہ کسی مسئلہ میں اصح
رسول مختلف ہوں تو کیا ہمارے لیے جائز ہے کہ ہم غور کر کے یہ فیصلہ کریں کہ ان میں سے درس
قول کون سا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ کے اصحاب کے درمیان ایسا غور و فکر کر
جائز نہیں (لا یجوز النظر بین اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) الصیرفی کہتے ہیں کہ
نے پوچھا کہ پھر کس کے قول پر عمل کیا جائے۔ احمد بن حنبل نے کہا کہ ان میں سے جس کی بھی چ
اتباع کر لو (تقلّد ایہم شئت) جامع بیان العلم وفضلہ، ابن عبدالبر ۲/۸۳
امام احمد بن حنبل کی یہ بات بجائے خود نہایت درست ہے۔ کیوں کہ ہم کسی صحابی کو صحیح
کسی صحابی کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے لیے ہر صحابی قابل اتباع ہے۔ تاہم اس جواب میں
بات کی علمی توجیہہ موجود نہیں ہے کہ ایسا مسلک کیوں درست ہے۔
اس کے بعد دوسرا مسلک وہ ہے جس کو فقہا کی ایک تعداد نے اختیار کیا مثلاً امام مالک
سے پوچھا گیا کہ صحابہ کے اختلافات میں کیا کرنا چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ان میں کچھ نادرس
ہیں اور کچھ درست ہیں، تو ان پر غور کر کے کسی کو اختیار کرو (خطأ وصواب فانظر فی ذلک
جامع بیان العلم وفضلہ
امام ابوحنیفہؒ نے اور زیادہ واضح طور پر یہی بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ دونوں میں سے اَ
قول خطا ہے۔ اور اس خطا کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے (احد القولین خطأ والمأثم ف
موضوع) جامع بیان العلم وفضلہ
یہ جواب بدایۃً درست نہیں ہے۔ کیوں کہ مختلف اقوال میں سے ہر قول جب کسی صح
کی طرف سے ملا ہو تو ہم کو یہ حق نہیں کہ بطور خود ایک کو خطا اور دوسرے کو صواب کہیں
صحابہ کے مختلف اقوال کے سلسلے میں ہم مجبور ہیں کہ ہر ایک کو صواب سمجھیں۔ ان کے درمی

امتیاز قائم کرنا ہمارے لیے اپنی حد سے تجاوز کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

اس معاملہ میں زیادہ گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دین کے دو حصے ہیں۔ ایک اصول کا حصہ، اور دوسرے فروع اور جزئیات کا حصہ۔ مذکورہ تمام اختلافات فروع اور جزئیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے، ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ مثلاً پنج وقتہ نماز یا نمازوں میں رکعات کی مختلف تعداد کے بارہ میں تمام اہل اسلام متفق ہیں۔ البتہ آمین بالجہر اور آمین بالسر جیسے کثیر مسائل ہیں جن میں ان کے یہاں اختلافات پائے جاتے ہیں۔

اس تقسیم کو قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو فیصلہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ تمام انبیاء کو ایک ہی الدین (الشوریٰ ۱۳) دیا گیا ہے۔ الدین سے مراد دین کے اصولی اور اساسی احکام ہیں۔ یہ اصولی اور اساسی احکام ابدی ہیں اور یکساں طور پر ہر پیغمبر کو دیے جاتے رہے ہیں۔ ان کے معاملہ میں ایک نبی اور دوسرے نبی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

قرآن کے مطابق، دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو شِرعۃ اور منہاج (المائدہ ۴۸) کہا گیا ہے۔ یہ دوسرا حصہ مختلف پیغمبروں کے یہاں مختلف رہا ہے۔

یہی فرق اسلام میں داخلی طور پر بھی پایا جاتا ہے۔ گویا قرآن اور اسی طرح حدیث کے اتفاقی اجزاء کی حیثیت الدین کی ہے۔ اور اس کے بعد جو اختلافی اجزاء ہیں وہ اس حصۂ دین سے متعلق ہیں جن کو قرآن میں شِرعۃ اور منہاج کہا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خود شارع کی اپنی اسکیم کے مطابق، دین کے ایک حصہ میں توحُّد مطلوب ہے اور دین کے دوسرے حصہ میں تنوع اور توسّع۔ ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ اس کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اساسات دین (مثلاً اخلاص للہ) کی حیثیت اسپرٹ کی ہے اور فقہی احکام کی حیثیت فارم کی۔ اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ اسپرٹ میں ہمیشہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مگر فارم میں کبھی یکسانیت نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی۔ مثلاً مکان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ شلٹر کا کام دے۔ اس اعتبار سے ہر مکان یکساں ہوگا۔ مگر فارم کے اعتبار سے ہر مکان یکساں نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح دین اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے ہمیشہ ایک رہتا ہے۔ مگر فارم کے اعتبار سے اس میں تنوع ہوتا ہے اور یہ تنوع کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ صحابہ کے اختلاف کی اصل حقیقت یہی ہے۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کی ایک عظیم مثبت افادیت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی معاملہ میں جب اختلاف کا امکان ہو، اسی وقت اس میں ذہنی سرگرمیاں جاری ہوتی ہیں اور اس طرح انسانی فکر کا مسلسل ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ اگر اختلاف کی گنجائش نہ ہو تو ذہنی سرگرمیاں بھی جاری نہ ہوں گی، اور پھر انسانی فکر کے ارتقاء کا عمل بھی رک جائے گا جس کا آخری نتیجہ ذہنی جمود ہوگا، اور ذہنی جمود اس دنیا میں ذہنی موت کے ہم معنی ہے۔

اس عمل کے دوران لازماً اختلاف واقع ہوگا۔ کوئی عالم ایک رائے پر پہنچے گا، اور کوئی عالم دوسری رائے پر، اور کوئی عالم تیسری رائے پر۔ مگر رایوں کا اختلاف کوئی برائی نہیں۔ اصل قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ یہی واحد صورت ہے جس سے کسی گروہ کے اندر فکری سرگرمیاں جاری ہوتی ہیں۔ اور پھر فکری سرگرمیوں کے ذریعہ تخلیقیت (creativity) جنم لیتی ہے اور ذہنی ارتقاء کے راستے کھلتے ہیں۔ اس معاملہ میں "اختلاف" کی حیثیت فطری کورس کی ہے، اور فکری سرگرمیوں کی حیثیت نتیجہ کی، اور اصل قابل لحاظ چیز نتیجہ ہے نہ کہ کورس۔

اس معاملہ کی ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں ایک طرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ: فاعرض عنهم وتوكل على الله (النساء ۸۱) ان سے اعراض کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ دوسری طرف قرآن میں یہ حکم ہے کہ: يا ايها النبي جاهد الكفار والمنافقين (التوبہ ۷۳) اے نبی، کافروں اور منافقوں سے جنگ کرو۔

یہ دونوں آیتیں بظاہر ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ ایک آیت جن لوگوں سے اعراض کی تعلیم دیتی ہے، دوسری آیت انھیں لوگوں سے ٹکراؤ کا حکم دے رہی ہے۔ اس فرق و اختلاف نے ذہنوں کو جھنجوڑا اور لوگوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا۔

اب ایک خیال یہ قائم کیا گیا کہ قتال کی آیت نے اعراض کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے: (فاعرض عنهم) اى لا تعاقبهم۔ ويقال ان هذا منسوخ بقوله تعالى (يا ايها النبي جاهد الكفار والمنافقين) الجامع لاحكام القرآن للقرطبی ۲۹۰/۵

مگر ذہنی عمل یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ اس نے مزید کچھ لوگوں کے ذہن کو متحرک کیا۔ انھوں نے غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اعراض کی آیت منسوخ نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے

اس کو محکمات میں شمار کیا (القرطبی ۱۰/۲۰۲)

اب غور کیجئے تو یہی دوسری رائے قرآن کی روح کے زیادہ مطابق نظر آئے گی۔ اصل یہ ہے کہ اعراض ایک مستقل حکم ہے اور اس کا تعلق مومن کی عام اخلاقیات سے ہے۔ دعوت دیتے ہوئے، لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے، یا سفر کرتے ہوئے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے ناخوش گوار تجربات پیش آتے ہیں۔ ایسے تمام مواقع پر اعراض کا طریقہ اختیار کرنا ایک مستقل حکم ہے۔ مومن جاہلوں سے اعراض کر کے خلق عظیم کا ثبوت دیتا ہے جو دنیا و آخرت کی تمام سعادتوں کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔

جہاں تک جہاد (بمعنی قتال) کا تعلق ہے، وہ دفاع کی مصلحت کے تحت ہے۔ جب کسی گروہ کی طرف سے عملاً جارحیت کا فعل کیا جائے تو اس وقت اس کی جارحیت کو فرو کرنے کے لیے اس سے مقابلہ کیا جائے گا۔ قتال ایک وقتی حکم ہے اور اعراض ایک مستقل حکم۔

معلوم ہوا کہ "الدین" میں کوئی اختلاف نہیں۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف شریعت میں ہے۔ یہ اختلاف دو قسم کا ہے۔ ایک، وہ جو عبادات سے متعلق ہے، اور دوسرا، وہ جو معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔

عبادات میں جو اختلاف ہے وہ تمام تر اس کی ظاہری جزئیات میں ہے۔ اور اس نوعیت کا اختلاف یا فرق بالکل فطری ہے۔ کیوں کہ عبادت ایک ایسا عمل ہے جو ہمیشہ یکساں کیفیت کے ساتھ انجام نہیں دیا جا سکتا۔ کبھی آدمی کے اندر کیفیات زیادہ ہوں گی اور کبھی کم۔ یہی کیفی فرق عبادت کے ظاہری آداب میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ گویا عبادت کے اساسی اجزاء میں وحدت ہے اور عبادت کے ظاہری آداب میں تنوع اور توسع۔ اس معاملہ میں روایات میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ دراصل اسی تنوع کا ایک ریکارڈ ہے۔

ایک اور اعتبار سے یہی معاملات کی صورت بھی ہے۔ معاملات میں بنیادی احکام اگرچہ نہایت واضح ہیں۔ مگر وہ حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں جن میں کسی حکم کا انطباق مطلوب ہے۔ اس لیے انطباق کے اعتبار سے احکام کی جزئیات و فروع میں اکثر فرق کرنا پڑتا ہے۔ معاملات کے بارہ میں حدیث اور فقہ میں جو اختلاف ہے وہ اسی فرق باعتبار انطباق کی مختلف مثالیں ہیں۔

فرقہ بندی

مشہور روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنو اسرائیل کے لوگ بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت کے لوگ تہتر فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ سب کے سب آگ میں جائیں گے سوا ایک کے (کلھم فی النار الا واحدۃ) پوچھا گیا کہ اے خدا کے رسول، یہ ایک کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ طریقہ جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں (ما انا علیہ و اصحابی)

علماء اسلام نے "۷۲" گمراہ فرقوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً سید عبدالقادر جیلانیؒ نے غنیۃ الطالبین میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور نام بنام ان کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً خارجیہ، شیعہ، معتزلہ، مرجیہ، مشبہ، جہمیہ، ضراریہ، کلابیہ، وغیرہ۔ پھر ہر فرقے کے ذیلی فرقے۔ اس طرح انھوں نے اس تعداد کو بہتر اور تہتر تک پہنچا دیا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر فرقے اب صرف کتابوں میں ہیں، عملی دنیا میں ان کا کہیں وجود نہیں۔

تاہم ان تاریخی فرقوں کی اہمیت باعتبار حصر نہیں ہے بلکہ باعتبار علامت ہے۔ یعنی وہ علامتی طور پر بتاتے ہیں کہ امت میں جب گمراہی آئے گی تو وہ کس طرح اور کس راستہ سے آئے گی۔ ان فرقوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ تمام گمراہ فرقے اعتقادیات میں غیر ضروری خوض کے نتیجہ میں پیدا ہوئے۔ اور یہی ان کی اصل گمراہی تھی۔ غور و فکر اسلام میں مطلوب ہے۔ حتیٰ کہ قرآن کے نزول کا مقصد ہی تدبر بتایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صحیح تدبر آدمی کی معرفت حق میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس منحرفانہ تدبر ذہنی انتشار پیدا کرتا ہے، اور آخر کار گمراہی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

عقائد کا تعلق امور غیب سے ہے۔ غیب کے بارہ میں آدمی براہ راست علم حاصل نہیں کر سکتا تھا، اس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں اتنے ہی پر قناعت کیا جائے جو بتا دیا گیا ہے ((بھموا ما ابھمہ اللہ) اور نامعلوم کے دائرہ میں خیال آرائی کی کوشش نہ کی جائے۔ یہی اس معاملہ میں اصحاب رسول کا طریقہ تھا۔

جو آدمی اپنی غور و فکر کو معلوم کے دائرہ میں استعمال کرے وہ ما انا علیہ و اصحابی کا مصداق ہے، اور جو آدمی غیر معلوم یا ممنوعہ دائرہ میں خوض کرنے لگے وہ ہدایت کے دائرہ سے نکل گیا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ اللہ ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری۔ اس میں کچھ
یتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن کے دلوں میں ٹیڑھ
ہے وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، فتنہ کی تلاش میں اور اس کی تاویل کی تلاش میں۔
الاں کہ ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ پختہ علم والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم
ن پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے
یں جو عقل والے ہیں (آل عمران ۷)

یہ آیت بتاتی ہے کہ غلط قسم کا غور و فکر کیا ہے۔ اور وہ کون سا غور و فکر ہے جو آدمی کو ہدایت
طرف لے جانے والا ہے۔ اس آیت میں متشابہات سے مراد متماثلات ہے۔ یعنی تمثیلی اسلوب
ام۔ وہ باتیں جن کا تعلق غیبی حقیقتوں سے ہے ان کو قرآن میں تمثیل کی زبان میں بیان کیا گیا
ہے۔ مثلاً خدا کا ہاتھ تمثیل کی زبان ہے نہ کہ حقیقت کی زبان۔ اس طرح کی باتوں کو آدمی تعیین و تحدید
کے ساتھ نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے ان معاملات میں صحیح یہ ہے کہ مجمل علم پر قناعت کی جائے۔ اس سے
ہ جاننے کی کوشش آدمی کو صرف فکری انتشار (confusion) تک پہنچائے گی۔ اور فکری انتشار
ی کے اگلے نتیجہ کا نام گمراہی ہے۔

محکم سے مراد وہ آیتیں ہیں جو براہ راست زبان میں ہیں اور جن سے قطعی دلالت حاصل
وتی ہے۔ یہ معلوم انسانی دائرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سنجیدہ غور و فکر سے آدمی کے علم و یقین
یں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ ہدایت کے راستہ پر بڑھتا چلا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر جبر و قدر کا جو مسئلہ ہے وہ پورا کا پورا متشابہات سے تعلق رکھتا ہے۔
س کے بارہ میں مجمل علم پر قانع رہنا ہی عقل کا تقاضا بھی ہے اور شریعت کا تقاضا بھی۔ اور یہی عین
سائنسی نقطۂ نظر ہے۔

دوسری چیز وہ ہے جو عالم فطرت سے تعلق رکھتی ہے یعنی زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی نشانیوں پر
غور کرنا۔ یہ غور و فکر عین مطلوب ہے۔ اس قسم کا غور و فکر آدمی کے یقین کو بڑھاتا ہے۔ اس کی روحانیت
کو غذا فراہم کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کو ربانی شخصیت بناتا ہے۔ اس کو وہ اعلیٰ انسان بنا دیتا ہے
جس کو عام زبان میں حقیقت شناس اور مذہبی زبان میں خدا شناس کہا جاتا ہے۔

اختلاف رائے

مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۹۲۰-۱۸۵۱) تحریک خلافت کے پرجوش حامیوں میں سے تھے۔ ان کے شاگرد مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳-۱۹۶۳) تحریک خلافت کے مخالف تھے وہ اس تحریک پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ مگر استاد نے اپنے شاگرد کی اس "گستاخی" کو کبھی برا نہیں مانا۔ دونوں کے درمیان آخر وقت تک مخلصانہ تعلق باقی رہا۔

مولانا اشرف علی تھانوی ایک گفتگو کے ذیل میں اپنے استاد اور شیخ کے بارے میں کہتے ہیں "حضرت کے قلب پر میرے اختلاف سے ذرہ برابر بھی گرانی نہ تھی۔ ایک مرتبہ تحریک خلافت کے زمانہ میں حضرت کی بیٹھک میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے میرے متعلق برے بھلے الفاظ کہہ رہے تھے۔ کچھ الفاظ حضرت کے کانوں میں پڑ گئے۔ باہر تشریف لے آئے۔ بہت خفا ہوئے اور یہ فرمایا کہ خبردار، جو آئندہ ایسے الفاظ کبھی استعمال کئے۔ اور یہ فرمایا کہ میرے پاس کیا وحی آتی ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ سب ٹھیک ہے۔ میری بھی ایک رائے ہے، اس کی بھی ایک رائے ہے۔ ایک مرتبہ حضرت نے یہ فرمایا کہ ہمیں تو یہ فخر ہے کہ جو شخص تمام ہندستان سے بھی متاثر نہ ہوا اور کسی کی بھی پروا نہ کی وہ بھی ہماری ہی جماعت سے ہے۔"

ملفوظات حکیم الامت، مولانا اشرف علی تھانوی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، صفحہ ۱۱۴

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف کے معاملہ میں علماء امت کا طریقہ کیا ہونا چاہئے۔ اس طرح کے اختلافات میں وہی روح کارفرما ہونی چاہئے جس کو امام شافعی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے: میری رائے درست ہے، مگر احتمال خطا کے ساتھ، دوسرے کی رائے غلط ہے مگر احتمال صحت کے ساتھ۔ (رأیی صواب یحتمل الخطأ ورأی غیری خطأ یحتمل الصواب)

یہ اختلافات عام طور پر اجتہادی امور میں ہوتے ہیں اور اجتہادی امور میں ہمیشہ ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لئے صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ آدمی اختلاف کے باوجود اپنے آپ کو فریق ثانی کی نفرت سے بچائے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو شدت کے ساتھ پیش کرے، اس کے باوجود اس کی نفسیات یہ ہو کہ یہ معاملہ ۵۰ فیصد اور ۵۰ فیصد کا ہے نہ کہ صد فی صد کا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے (ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال $20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال $35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال $50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال $80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ) $100 / £50	

Finest collection of books on Islam

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013

Tel. 4611128 Fax 4697333